سلسلۂ مطبوعات البلاغ بک ایجنسی لاہور

اسلام اور نیشنلزم

اثر خامۂ گوہر ریز

بطلِ حریت، قائدِ اعظم، امام الہند حضرت علامہ ابو الکلام آزاد مدظلہ

ناشر

مہتمم البلاغ بک ایجنسی نمبر ۵ گوالمنڈی لاہور

سنہ ۱۳۴۷ھ مطابق سنہ ۱۹۲۹ء

رفیق عام پریس لاہور میں باہتمام منشی عزیز الدین پرنٹر
طبع ہو کر شائع ہوا

قیمت [illegible]

تعداد اشاعت ایک ہزار

2466
10917

مقدمہ

(۱) اسلام اور نیشنلزم (اسلام اور قومیت) پر علامہ ابو الکلام آزاد (متّع اللہ المسلمین بطول حیاتہٖ) نے اپنے مخصوص انداز میں جو معارف پرور، مبسوط اور نکات سے لبریز مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اور ایسے کشور گیر موضوع پر جو جامع اور حقیقت طراز بحث کی ہے سبحان اللہ! مضمون کی اہمیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ایسے ہی باکمال نکتہ شناس اور سیاست اسلامیہ کے اس عدیم النظیر اور فقید المثال مدبّر کے نتائج افکار کی ضرورت تھی۔ جو اس آڑے وقت میں جمہور مسلمانوں کی راہنمائی بطریقِ احسن سرانجام دیتے۔ اس بحر ناپیدا کنار کی غواصی کیلئے ایسا ہی غواص درکار تھا جس کے فراہم کردہ آبدار گوہر اور تابدار موتی قلب و دماغ کی تاریکیوں میں ضیا پاشیاں کر کے نور و تجلی کی تاسیس کا موجب ہوتے۔

(۲) عشق و شیفتگی کا تقاضا ہے۔ کہ ہر مسلمان کے دل میں کتاب و سنّت اور علوم و فنون کے اس عظیم الشان سرچشمہ کیلئے بڑی سے بڑی تڑپ اور استفادہ و استفاضہ کا ایک لازوال جذبہ پیدا کر دیا جائے۔ لیکن اپنی علمی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا خیال اس اہم کام کی تکمیل میں ہمیشہ سدِّ راہ رہا ہے۔ علوم و فنون کے دلدادہ جو ان کی تصنیفات عالیہ اور افکار ہما پایہ سے بہرہ مند و فیضیاب ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے کما حقہٗ آگاہ ہیں کہ راہ علم و فضل اور تجدید و اصلاح میں ان کا پایہ کس قدر بلند، اعلیٰ و ارفع ہے۔ جہاں ایک طرف ان کا وجود مسعود علمی کاوش و تحقیق میں منہمک رہتا ہے۔ وہاں اعلائے کلمۃ الحق میں بھی وہ پیش پیش رہتے ہیں۔ میدان عمل میں ان کی سرفروشانہ جد و جہد۔ اور حق و صداقت کی نشر و اشاعت کیلئے مردانہ وار کوشش و سعی میں وہ مصائب و آلام کی صبر آزما

اغراض و مقاصد

اس وقت کائنات ارضی میں عجیب ہنگامۂ جنگ و دو و تخریب برپا ہے۔ بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام اقوام کشمکش حیات کے نئے دور میں داخل ہوئی ہیں۔ امپیریلزم، سوشلزم، بالشویزم، قیصریت و عسکریت باہم دست و گریباں ہیں۔ فتح و نصرت کا سہرا آخرکار اس مقنن ازلی اور قانون ساز حقیقی کے وضع کردہ اصولوں کے سر ہی رہیگا جن کا سرچشمہ اور منبع اسلام ہے "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"۔ باطل کو حق و صداقت کے مقابلے میں دائمی عروج حاصل نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ یہ عالم عالم اسباب ہے اور باہم آویزش و چپقلش کے ادوار میں جد و جہد پیہم اور سعی مسلسل کی ضرورت لابدی ہے اسلئے ناگزیر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو صراط مستقیم اور صحیح ذوق عمل سے آشنا کیا جائے اور اسلاف کے ان اصولوں کو ہر فرد ملت کے سامنے علم نشرح کیا جائے جن پر گامزن ہو کر وہ تسخیر عالم میں بھی کامیاب ہو سکیں۔ اور عقبیٰ میں بھی سرخرو ہوں۔ ان حقائق کو مدنظر رکھکر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ چیدہ چیدہ باکمال اور ممتاز اہل قلم اور مجاہدان حق کی تصانیف کی طباعت و اشاعت کا بندوبست کیا جائے جو ارزاں قیمت پر افراد ملت تک پہنچائی جائیں۔ اسکے ساتھ ہی ہماری اردو بھی جو ہند میں نہ صرف شہنشاہان اسلام کی یادگار ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی قومی زبان ہے بلکہ اپنے علمی سرمایہ کی وسعت کے لحاظ سے تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اسکے عروج و ترقی کی خاطر ساعی ہونا بھی ایجنسی کے عظیم ترین مقاصد میں داخل ہے اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ علم نواز اور معارف پرور پبلک کی قدردانی پر یہ ایجنسی ہمیشہ بیش از بیش خدمات ملی کے واسطے مستعد رہے گی!

المستدعی مہتمم البلاغ بک ایجنسی نمبر ۵ گوالمنڈی لاہور

اسلام اور نیشنلزم

بہ بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد!

یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں جو زمانہ سب سے زیادہ باہر کے اسلامی معاملات کے انہماک کا زمانہ تھا۔ یعنی حرکت خلافت کا زمانہ، اُسوقت کسی شخص کو بھی یہ خیال نہیں گزرا کہ باہر کے اسلامی معاملات میں اسقدر دلچسپی لینا ہندوستانی قومیت کے نقطۂ خیال سے کہاں تک موزوں ہوسکتا ہے، یا یہ کہ نام نہاد پان اسلامیزم اور ہندوستانی نیشنلزم دو متضاد جذبے ہیں جو بہ یک وقت جمع نہیں ہوسکتے۔ بلاشبہ اُسوقت بھی ایک گروہ حرکت خلافت کا مخالف تھا لیکن اُسمیں ہندو مسلمان دونوں تھے، اور اسکی مخالفت بھی اس بنا پر نہ تھی کہ یہ معاملہ ہندوستان کے جغرافیائی حدود سے باہر کا ہے، بلکہ اسلئے تھی کہ وہ اسقدر دُور تک جانا پسند نہیں کرتا تھا جسقدر دُور یہ حرکت جانا چاہتی تھی۔ مطالبات خلافت پر موقوف نہیں خود ہندوستان کے سیاسی مطالب کیلئے بھی وہ اس طریق عمل سے متفق نہ تھا۔

لیکن جونہی ۱۹۲۲ء میں حرکت کی سرگرمیاں رُکیں اور لوگوں کے ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے فوراً طرح طرح کی بحثیں اور کاوشیں شروع ہوگئیں۔ اب ہر شخص سوچنے لگا کہ ہندوستان کے جغرافیائی حدود سے باہر کے معاملات میں اسقدر دلچسپی لینا کہاں تک قومیت و وطنیت کے جذبات کیساتھ جمع ہوسکتا ہے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا او

بھی دجل و شیطنت کی فرمانفرمائی اور حکومت ہوگی۔ وہ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھیگا۔ روس کی اشتراکیت۔ برطانیہ کی ہوس ملک گیری۔ جرمنی کی قیصریت۔ اطالیہ کی استبدادیت اسلام کے نزدیک قابل صد ہزار نفریں ہیں۔ اس کے آئین و قوانین امیر و غریب۔ اعلےٰ و ادنےٰ۔ شاہ و گدا تمام عالم کیلئے اس طرح وضع کئے گئے ہیں کہ آج اگر تمام دنیا ان پر عمل پیرا ہو جائے تو فتنہ و شر کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کیطرح مِٹ جائے۔ ایک مسلمان کسی خاص جگہ مقیم ہو کر جہاں اپنے ہموطنوں کے ساتھ حریت و آزادی کیلحاظ مصروفِ عمل ہو سکتا ہے۔ وہاں بیرونی دنیا کے ساتھ بھی ہمدردی کر سکتا ہے۔ اور یہ جذبہ مانع نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ اپنے وطن کی آزادی و ترقی کیلئے ساعی و کوشاں ہو۔ مضمون ازبسکہ بہت طویل ہے۔ اور بالخصوص جب اس کے مصنف امام الہند۔ ابلغ البیان۔ افصح اللسان۔ حجۃ العصر علامۃ الدہر صمصام اسلام۔ آقائے ابو الکلام آزاد مدفیوضہٗ ہوں۔ تو اُنکے حقائق و معارف کی موجودگی میں کسی تمہید و مقدمہ کا تحریر کرنا آفتاب کو مشعل دکھانا ہے۔ لیکن یہ چند سطور جو سپردِ قلم ہوئیں انکی اصلی غرض و غایت پبلک کو اختصار کیساتھ علامہ ممدوح کی شخصیت عظمیٰ اور مضمون کا تعارف پیدا کرانا منظور تھا۔

(۴) حالات کا تقاضا تھا۔ کہ "نیشنلزم" کے مفہوم کے متعلق اطراف و اکنافِ ہند میں جو مذبذب۔ متزلزل اور مضطرب ذہنیت پیدا ہو چکی ہے۔ اور جس کا مسموم اثر غیر مسلم پروپیگنڈا کی وجہ سے مسلمان نوجوانوں کو مذہب اور سیاست کی مغائرت کا یقین دلا رہا ہے۔ اسکا انسداد کیا جائے۔ الحمد للہ کہ ہمیں علامہ ممدوح نے اپنے نتائج افکار شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔ ہم آقائے موصوف کا جنکو صحیح معنوں میں مجدد سیاسیہ اسلامیہ کے خطاب سے مخاطب کیا جا سکتا ہے۔ بصد عجز و نیاز اس کرم گستری کا شکریہ ادا کرتے ہیں:

نیازمند منیجر

کہ قضاؤ قدر کے مسئلہ میں وہم وگمان کا دخل بھی جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن جب قضاؤ قدر اور جبر واختیار کی گتھی سُلجھانے کیلئے اُنہوں نے پچاس سے زیادہ مذہب گڑھ لیئے، تو وحشی تاتاریوں کے جولانِ قدم سے اُن کے تمام دارالخلافے پامال ہو رہے تھے!

آج بھی یورپ کی قوموں میں اسکی مثالیں صاف نظر آرہی ہیں۔ اینگلو سکسن نسل کے مقابلے میں فرانسیسی قوم زیادہ ذہنی اور تخیل پسند ہے، اور اسلئے کسی طرح بھی اپنا روز افزوں تنزل روکنے پر قادر نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں حالات کی رَو نے ذہن و تخیل کو زیادہ بے لگام ہونے کی مُہلت ہی نہیں دی تھی۔ مہاتما گاندھی نے مسئلہ خلافت کو محض اُسکی سادہ اور عملی شکل میں دیکھا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے اس سے زیادہ سوچنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ مسلمانوں کا مطالبہ حق وانصاف کے خلاف نہیں ہے، اور اگر ہندؤں نے ان کا ساتھ دیا تو اس سے دونوں کے دل زیادہ قریب و متفق ہو جائیں گے۔ دراصل ملک کو اُس کی موجودہ منزلِ حیات میں اس سے زیادہ کاوش کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ اُٹھے، اور قبل اس کے کہ ذہن و خیال کو چنیں و چناں کی مُہلت ملے، کام شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر ایک عام حرکت ظہور میں آگئی۔ مطالبۂ خلافت ہندو مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن گیا تھا۔ سینکڑوں ہزاروں ہندؤں نے اسمیں ویسی ہی گہری اور بے ریا دلچسپی ظاہر کی جیسی خود مسلمان ظاہر کر رہے تھے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض حالتوں میں خود مسلمانوں سے بھی اُن کے قدم پیش پیش تھے۔

لیکن جب عملی مشغولیت کا دَور ختم ہو گیا تو ردّ فعل کا عمل درآمد شروع ہو گیا۔ وہی چیز جو چند دن پہلے ملک کا سب سے زیادہ مقبول عمل تھی، اب ایک مشتبہ اور بحث طلب چیز بن گئی، اور فکر و خیال نے طرح طرح کی کاوشیں شروع کر دیں۔ جسوقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ قیدخانے جا رہے تھے تاکہ ٹرکی کے ساتھ انصاف کیا جائے، اُسوقت کسی کو

مسلمانوں سے گزر کر اسلام کی تعلیم تک پہنچ گیا۔ اب سینکڑوں دماغ و قلم ہیں جنہیں اس سوال کی بحث و کاوش سے فرصت نہیں ملتی کہ اسلام کی دینی تعلیم کی روح، قومیت کے موافق ہے یا مخالف؟

یہ حالت بظاہر کتنی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے مگر فی الحقیقت عجیب نہیں ہے۔ علم الاجتماع کے مطالعہ کرنے والے ایسے ہی احوال و تغیرات میں جماعت کے ذہنی قوانین کی جستجو کیا کرتے ہیں۔ جب آدمی بیکار ہوتا ہے تو ضرورت سے زیادہ سوچنے لگتا ہے۔ مشغول آدمی کو زیادہ خیال آرائیوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ یہی حال جماعتوں اور قوموں کا بھی ہے۔ جب تک وہ عملی زندگی میں مشغول رہتی ہیں، ذہن و فکر کو ضرورت سے زیادہ دقیقہ سنجیوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ لیکن جونہی ہاتھ پاؤں بیکار ہو جاتے ہیں، ذہن و خیال ابھر آتا ہے اور اپنی کارستانیاں شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ارادہ کی ساری قوت عمل میں مشغول تھی۔ اب عمل کی جگہ تخیل کیلئے وقف ہو جاتی ہے۔ پہلے کسی کو ذہنی بلند پروازیوں کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اب جس کسی کو دیکھو غیر ضروری بحثوں، بے محل کاوشوں، فرضی صورتوں تخمینی سوالوں، بے قید تخیلات، اور مطلق العنان اوہام و ظنون سے سرگرم ہو جاتا ہے!

ذہن و عمل کے قویٰ کا یہی عدم توازن ہے جس سے جماعتوں کی زندگی میں عملی استعداد کی افسردگی اور تعطل کی بنیاد پڑتی ہے، اور بعض اوقات یہ علت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ عمل کی استعداد بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ یا اس درجہ کمزور پڑ جاتی ہے کہ کوئی نمایاں اور عظیم قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

ہر قوم کی تاریخ میں اس حالت کی مثالیں ڈھونڈھی جا سکتی ہیں۔ قومی عروج کے زمانے پر نظر ڈالوگے تو وہ سرتاپا عمل نظر آئیگا، لیکن تنزل کا عہد دیکھوگے تو عمل کی جگہ تخیل کی فرمانروائی ہوگی۔ پہلی حالت میں تخیل محدود مگر قدم بے روک ہوتا ہے۔ دوسری حالت میں قدم رک جاتا ہے مگر خیال آسمان پیمائیاں شروع کر دیتا ہے۔ عربوں نے جب روم اور ایران کے تخت الٹ دئے تھے تو ان کی سادگی فکر کا یہ حال تھا

(۱)

حیاۃ اجتماعیہ اور اس کا سلسلۂ ارتقاء

"قومیت" کیا ہے؟ انسان کی اجتماعی زندگی کے احساس و اعتقاد کی ایک خاص حالت کا نام ہے جو انسانوں کو کسی ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے ذریعہ اس کی ایک بڑی جمعیت باہم مربوط ہو کر زندگی بسر کرتی اور اجتماعی زندگی کے کشائش سے بہرہ یاب ہوتی ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ اس بارے میں اسلام کی تعلیم و تحقیق پر نظر ڈالی جائے خود انسان کی حالت پر نظر ڈالنی چاہیئے کہ اس کے اجتماعی رابطوں اور رشتوں کے احساس و اعتقاد کا کیا حال ہے؟

جس طرح کائنات ہستی کی ہر شے پر قانون نشوو ارتقا جاری ہے یعنی ہر چیز ابتدائی حالت سے انتہائی درجہ تک طفولیت سے رشد و بلوغ تک تنگی سے وسعت تک پستی سے بلندی تک اور نقص سے کمال تک بتدریج ترقی کرتی ہے اور اس رفتار ترقی میں اسے مختلف درجوں اور منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، اسی طرح انسان کا احساس اجتماع بھی تدریجی ترقی کا ایک پورا ارتقائی سلسلہ ہے۔ یہ ایک نہایت محدود اور تنگ دائرہ سے شروع ہوتا ہے لیکن بتدریج بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ اور بالآخر وسعت و بلوغ تک پہنچ جاتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح اس کی بھی ایک طفلانہ ابتدا کی ہے اور ایک انتہا کی ہے۔ ابتدائی کڑی میں اس کا احساس اس کے جسم و دماغ کی طرح گہوارۂ طفولیت میں سوتا نظر آتا ہے۔ پھر جوں جوں دماغی ادراک نشوونما پاتا ہے، اجتماعی رشتوں، علاقوں کا احساس بھی وسعت پذیر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے اس نقطۂ بلوغ و کمال تک پہنچ جاتا ہے جو اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے:

حلقات تسعہ ارتقا

انسانی حالت پر ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالی جاتی ہے۔ نوعی اور فردی

کبھی یہ بات نہ سوچی کہ اس مطالبہ کا اس درجہ انہماک ہندوستانی قومیت کے ساتھ میل کھاتا ہے یا نہیں؟ لیکن اب ہر شخص اسی خیال سے متفکر ہے اور کوئی قلم و لسان نہیں جس پر یہ سوال طاری نہ ہوا!

ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو نکتہ چینی کے رنگ میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان اہل قلم ہیں، اور چونکہ خود ان کے سامنے بھی کوئی صاف اور واضح حقیقت نہیں ہے۔ اس لئے کچھ عجیب طرح کے افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے الہلال کے پچھلے صفحات پر اس قسم کی بحثیں دیکھی تھیں کہ اسلام کی وسعت نظر وطنیت کی تنگ نظری کی متحمل نہیں، چونکہ بات کے محل اور موقعہ پر ان کی نظر نہیں ہے تو اس لئے وہ اسکا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام "نیشنلزم" کا مخالف ہے اور کسی مسلمان کو نیشنلسٹ نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مسلمانان ہند کی سیاسی بے بسی سے سخت نالاں ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ باہر کے اسلامی مسائل کیلئے ان میں جسقدر دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اسقدر خود اپنے ملک کیلئے نہیں ہوتی تو وہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی وسعت علائق و احساس ہی اس صورت حال کے لئے ذمہ دار ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اب اسے خیرباد کہہ دیا جائے۔

حالانکہ نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، نہ قومیت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں۔ اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈھنی چاہئے۔

وہ وسط کیا ہے؟

اس تحریر سے مقصود اسی کی جستجو و تحقیق ہے چونکہ مسئلہ کے اطراف وسیع ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ انہیں چند حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

تمدن کے وجود میں آنے سے پہلے انسان انفرادی اور خلقی زندگی بسر کرتا ہوگا۔ اُسوقت ازدواج مدنی (یعنی تعین والتزام کے ساتھ مرد عورت کے ملنے) کا وجود نہ تھا۔ ممکن ہے عام حیوانات کی طرح ولادت کا بُنیادی رشتہ محض امومتہ کا رشتہ ہو اور ابوۃ کا تعین اور تشخص وجود میں نہ آیا ہو۔ میں نے "ممکن ہے" کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ اِس بارے میں علماء علم الانسان کے نظریات مختلف ہیں اور کوئی واضح روشنی موجود نہیں۔ بہرحال ابتدا میں ابوۃ کا تشخص ہو یا نہ ہو جس دن سے یہ تشخص شروع ہوا ہے، امومتہ کے بعد احساس اجتماع کی دوسری منزل یہی ہے۔

"عائلہ" عربی میں خاندان کو کہتے ہیں لیکن خاندان کا لفظ ہماری زبان میں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ "عائلہ" کا اطلاق اُس سے کم تر دائرے پر ہوتا ہے۔ اس سے مقصود وُہ قریبی رشتہ دار ہیں جن کے اکٹھے ہونے سے ایک گھرانے کی مشترکہ زندگی کا نظام قایم ہوتا ہے۔ یہ اس سلسلۂ ارتقا کی تیسری کڑی ہے۔ انسان نے جب انفرادی زندگی کی جگہ مِل جُل کر رہنا شروع کیا تو اس کا پہلا منظر یہ تھا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کا حلقہ بنا کر رہتا تھا تاکہ زندگی کی کش مکش میں تنہا رہنے کی جگہ ایک جتھا پیدا ہو جائے۔ "قریبی رشتہ داروں" کے اِس احساس ہی سے اجتماعی ارتقا کی یہ تیسری منزل وجود میں آتی ہے کیونکہ اب ماں باپ کے علاوہ دوسرے انسانوں کا بھی رشتہ محسوس کیا جانے لگا اور اجتماعیہ کے احساس میں وسعت ہوگئی۔

"قبیلہ" اس سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے۔ اور یہ بہ نسبت "عائلہ" کے زیادہ وسیع حلقہ مہیا کرتی ہے۔ تمدن کے ابتدائی ایام میں جب کچھ عرصہ "عائلہ" کا نظام جاری رہا تو ہر خاندان کی نسل بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ پانچ پانچ دس دس پشتیں گزرنے کے بعد ہر خاندان کے افراد کی تعداد سیکڑوں ہزاروں تک پہنچ گئی۔ اتنی بڑی تعداد

نوعی سے مقصود یہ ہے کہ بحیثیت ایک نوع کے اُسپر جو کچھ گزر چکا ہے اس کی جستجو کی جائے۔ انفرادی سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ ایک انسانی وجود پر جو کچھ گزرتا ہے اُسکی تحقیق کی جائے۔ پہلی کے لئے تاریخ و آثار کا اور دُوسری کیلئے خود انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر انسان کی حالت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی احساس و ادراک کا یہ سلسلہ ارتقا نوع اور فرد دونوں زندگیوں میں یکساں طور پر موجود ہے، اور اس کی بڑی اور اصولی کڑیاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) امومۃ
(۲) ابوۃ
(۳) عائلہ
(۴) قبیلہ
(۵) بلدیۃ
(۶) وطنیۃ
(۷) جنسیت و قومیۃ
(۸) برّاعظمیت یا تقسیم
بہ لحاظ جغرافیہ
(۹) انسانیت و ارضیۃ

”امومۃ“ کے معنی عربی میں ماں ہونے اور ماں کے رشتہ کے ہیں۔ اس سے مقصود انسان کی وہ ابتدائی حالت ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی ساری دنیا صرف ماں کی گود ہوتی ہے۔ اس ابتدائی منزل میں انسان کا علاقۂ اجتماع صرف ”امومۃ“ میں محدود ہوتا ہے۔ فطرۃ کا فرشتہ اُس کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے معصوم ہاتھ ماں کی گردن میں حمائل ہو جاتے ہیں۔ یہ فردیۃ سے اجتماعیت کی طرف انسان کا پہلا قدم ہے۔

”ابوۃ“ سے مقصود باپ کا رشتہ ہے۔ ماں بچے کو باپ کے آغوشِ محبت میں رکھ دیتی ہے۔ اور اب وُہ ماں کے ساتھ ایک دوسرے وجود کا رشتہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔

انسان کا احساسِ اجتماع صرف نسل کے رشتے میں محدود تھا کیونکہ اُس کے دماغ کے لئے سب سے زیادہ قریبی رشتہ یہی تھا اور ہمیشہ اُس کے ادراک کا سفر قرب سے بعد کی طرف ہوتا ہے، لیکن اب ایک دوسرا رشتہ بھی دعوتِ اعتقاد دینے لگا۔ ابتدا میں انسان کی زندگی محض انفرادی زندگی تھی، پھر عائلہ اور خاندان کی بنیاد پڑی، لیکن پھر بھی وہ عرصہ تک ویسی ہی غیر شہری زندگی بسر کرتا رہا جیسی آجکل بھی صحرائی قبائل یا ایشیا اور یورپ کے جپسیوں کی زندگی ہے۔ وہ پانی، چارہ اور غذا کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرتا رہتا تھا۔ لیکن جب ایک کافی مدت اس حالت پر گزر گئی، تو ہر قبیلہ اور گروہ کے لئے کوئی خاص حصۂ زمین مسکن و مولد کی شکل میں متعین ہو گیا مثلاً کوئی خاص قبیلہ تھا جو خزاں میں ایک جگہ رہتا اور بہار میں دوسری جگہ چلا جاتا عرصہ کے تواترِ قیام سے یہ دونوں مقام اُس کے لئے مسکن و موطن بن گئے۔ یا کسی جماعت نے کسی ایک ہی مقام پر قیام اختیار کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ اس جگہ میں اپنے لئے خصوصیت محسوس کرنے لگی ساتھ ہی ایسا بھی ہوا کہ مختلف قبائل کسی ایک ہی حصۂ ارضی میں آس پاس رہنے لگے اور عرصہ تک قریب رہنے کی وجہ سے اِن میں باہمی قرب و علائق کی ایک خاص حالت پیدا ہو گئی۔ اِن اسباب سے اُس اجتماعی احساس کی اور جذبہ کی بنیاد پڑی جسے میں نے "بلدیۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس احساس کی پانچویں منزل ہے اس منزل میں پہنچکر انسان ایک نیا رشتہ محسوس کرنے لگا جو کسی ایک ہی جگہ رہنے سہنے اور وہیں پیدا ہونے کے اشتراک کا رشتہ ہے۔

ایک مدت تک جس مقام پر انسان رہتا ہے قدرتی طور پر اُس سے زیادہ مانوس ہو جاتا ہے اس اُنس کے اسباب ایک سے زیادہ ہیں۔ اوّل تو اُس مقام کی ارضی خصوصیات کے ساتھ اُسکی زندگی کے حالات کچھ اس طرح مل جل جاتے ہیں کہ وہاں کے ہر موسم اور ہر حالت کے ساتھ اس کی زندگی کی کوئی نہ کوئی حالت وابستہ ہو جاتی ہے، اور اس کے تصور میں

صرف عائلہ کی چہار دیواری میں سمٹ نہیں سکتی تھی اس لئے قدرتی طور پر ایک وسیع تر حلقۂ تعارف پیدا ہوگیا اور باوجود مختلف جگہوں میں رہنے کے ہر فرد اس حلقہ کی نسبت سے پہچانا جانے لگا۔ جنگ و صلح کے موقعہ پر بھی یہ حلقے ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہونے لگے اور اس طرح "قبیلہ" کی بنیاد پڑی اور اب اس منزل میں پہنچکر وہی انسان جس کا احساس اجتماع صرف "اسرہ" اور "عائلہ" میں محدود تھا، اپنے آپ کو ایک وسیع حلقۂ انسانی کا رکن سمجھنے لگا۔ یہ پورا حلقہ ایک خاص مورث اعلیٰ کی طرف اپنے آپکو منسوب کرتا، اور اس کے وجود کو اپنی رشتہ داریوں اور قرب جوئیوں کے لئے اعتقاد و شرف کا مرکز ٹھہراتا یہیں سے نسب کی بنیاد چلی اور اس کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ عرب، افریقہ ہندوستان، امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں آجتک قبائل کا نقش قدم ڈھونڈھا جاسکتا ہے عرب میں تو قبائل کی تقسیم اور نسب کی حفاظت کا ایسا دور دورہ رہا کہ تمدنی اور شہری زندگی کا اختلاط بھی اُسے نہ مٹا سکا۔ اسوقت بھی اندرون عرب میں ہر قبیلہ بہ حیثیت قبیلہ کے اُسی طرح موجود ہے جس طرح چھٹی صدی عیسوی سے پہلے تھا۔ ہندوستان میں راجپوتوں کے مختلف نسلی سلسلے اور سورج بنسی اور چندر بنسی کا انتساب بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

یہ جو نسل انسانی کی آج بڑی بڑی اصولی تقسیمیں کی جارہی ہیں مثلاً سامی، آرین منگولین، تو ان کی بھی بنیاد جب پڑی ہوگی، اسی "قبیلہ" کی منزل میں پڑی ہوگی۔ اب اگرچہ نسل انسانی اس منزل سے بہت آگے بڑھ چکی ہے، لیکن اس کی انفرادی زندگی میں یہ اب بھی ویسی ہی درمیانی منزل ہے، جیسی بہ حیثیت نوع کے تاریخ میں پیش آئی تھی اب بھی جب انسان کا بچہ بڑا ہوتا ہے اور طفولیت کے سادہ احساسات کی جگہ تربیت و سماع کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ تو وہ اپنے گھرانے کے حلقہ سے ایک زیادہ وسیع حلقہ رشتہ داریوں کا محسوس کرتا ہے۔ یہی احساس "عائلہ" کے بعد "قبیلہ" کا احساس ہے۔ اس چوتھی کڑی پر نسل کا دائرہ ختم ہوجاتا ہے، اور مکان کا رشتہ ظہور کرتا ہے۔ اب تک

× × × × × × × × × نسلی دائرہ سے زیادہ وسیع و عام دائرہ اپنے گرد کھینچ لیا۔ یہ دائرہ مختلف قبیلوں اور نسلوں کو باہم دگر مربوط و متحد کر دیتا ہے۔

”وطنیت“ کے بعد جذبۂ اجتماع کیلئے ”جنسیت“ کی منزل نمایاں ہوتی ہے۔ اس سے مقصود انسانی علاقہ کا ایک ایسا وسیع دائرہ ہے جو تمام پچھلے دائروں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، اور اُن سب سے بالاتر رشتہ اشتراک پیدا کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ رشتہ کسی خاص اصل پر مبنی ہو۔ کہیں وطنیت نے ایک زیادہ وسیع صورت اختیار کر لی ہے اور دُوسری وطنیتوں کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ کوئی بعید تاریخی نسل کا اشتراک نقطۂ اتحاد بن گیا ہے اور جس قدر انسانی جماعتیں اس سے وابستگی پیدا کر سکتی ہیں، پیدا کر لیتی ہیں، اگرچہ مختلف اقطاع ارضی میں آباد ہوں۔ رنگ اور زبان بھی اسمیں وجہ اشتراک کا کام دیتی ہے اور وہ تمام مختلف وطنیتیں اور نسلی جماعتیں شامل ہو جاتی ہیں جو رنگت میں یا زبان کے ابتدائی مواد میں اشتراک رکھتی ہوں۔ ”جنسیت“ کا یہ دائرہ تمدن کی وسعت و ترقی اور ملکی و سیاسی مقاصد کی کشمکش سے بتدریج ظہور پذیر ہوا۔ مختلف وطنیتوں نے دیکھا کہ وہ وطنیت کے دائرہ سے بھی زیادہ وسیع دائرہ اتحاد اور ہمرشتگی کا پیدا کر سکتی ہیں جو مختلف وطنیتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیگا، اس لئے انہوں نے جنسیت کی طرف قدم بڑھایا۔ امریکن جنسیت دُنیا کی مختلف نسلوں اور وطنیتوں کا مجموعہ ہے۔ فرانسیسی جنسیت ہر اُس فرد کو اپنے میں شامل کر لیتی ہے جو چند خاص اجتماعی و معیشی عقاید و اعمال میں شریک ہو جاتا ہے۔ لاطینی جنسیت اُن تمام قوموں کو منسلک کرتی ہے جو لاطینی حلقہ کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ سفید، سُرخ، زرد، اور گندمی رنگت کی بھی تقسیم پیدا ہو گئی، اور جنس کا کام دینے لگی۔

بہرحال احساس اجتماع کا یہ ایک ایسا دائرہ ہے جو تمام پچھلے دائروں سے زیادہ وسیع

اُس کے لئے کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ ثانیاً، مشاہدہ کے استمرار و تواتر میں بجائے خود حیوانی دماغ کیلئے تاثیر ہے۔ جن چیزوں سے اس کا لگاتار واسطہ رہتا ہے قدرتی طور پر اُن سے زیادہ مالوف ہو جاتا ہے۔ ثالثاً، مکان و قیام کے ساتھ نسل و رفاقت کے بھی تمام رشتے جمع ہو جاتے ہیں۔ جس مقام پر انسان پیدا ہوا ہو اور پرورش پائی ہو وہیں اس کے تمام عزیز و اقارب اور جانے پہچانے ہوئے آدمی ہوتے ہیں اور اس لئے اُن کی محبتوں کی یاد وہاں کے چپہ چپہ میں بس جاتی ہے۔ غرضیکہ انسان نے نسل کے بعد مکان و توطن کا رشتہ بھی محسوس کیا اور بہ تدریج اس کی گیرائیاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ یہ اس کے جذبات محبت کا مرکز اور مکانی دل بستگی کے ولولوں کا محور بن گیا؛

الا لیت شعری ہل ابیتن لیلۃ
بواد، وحولی اذخر وجلیل!

"بلدیۃ" کے بعد چھٹی کڑی "وطنیۃ" کی آتی ہے۔ وطنیۃ "بلدیۃ" کے رشتہ کی ایک خالص ترقی یافتہ صورت کا نام ہے جب تمدن میں مزید ترقی و وسعت ہوئی، بکثرت آبادیاں اور شہر بس گئے، اور انسان کے باہمی علائق بھی زیادہ وسیع ہوئے، تو "بلدیۃ" کے جذبات میں بھی وسعت شروع ہو گئی، اور اب انسان نہ صرف اپنے مسکن و مولد ہی کو بلکہ اُس تمام علاقے کو اپنا وطن محسوس کرنے لگا جس کے ایک گوشہ میں وہ آباد تھا۔ پھر بتدریج اس دائرہ میں اور وسعت ہوئی، چھوٹے چھوٹے علاقوں کی جگہ زمین کے بڑے بڑے حصے داخل ہو گئے، یہاں تک کہ اب ایک پوری اقلیم بھی مفہوم وطنیۃ میں داخل ہو جاتی ہے!

نسل کے اجتماعی احساس نے افراد کی کثرت، نسل کے نقطۂ وحدت میں سمیٹ دی تھی۔ اب مسکن و مکان کی وحدت نمایاں ہوئی اور اس نقطۂ وحدت نے

ہیں لیکن اگر جستجوئے حقیقت کا قدم رُکے نہیں تو بالآخر وحدۃ، نوع، اور کل کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی نسل، وطن، قوم، جنس، سفید، سیاہ، افریقی، ایشیائی بہت سے اسماء گڑھ لیئے گئے تھے، حالانکہ مسمّیٰ ایک سے زیادہ نہ تھا اور وہ صرف "انسان" ہے:

عباراتنا شتیٰ وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر!

وحدت سے کثرت کیطرف

تم نے نوعِ انسانی کو اُس کی طفولیت کے گہوارہ میں دیکھا؟ یہ وہی انسان ہے جس کی وسعتِ نظر و علائق کیلئے آج کرۂ ارضی کا پورا دائرہ بھی کافی نہیں ہے۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے کہ نظامِ شمسی کے دوسرے ستاروں سے اپنا رشتۂ وجود جوڑ لے، لیکن اُسوقت کیا حال تھا؟ اُس وقت اس کے ادراک و احساس کی غفلت و محجوبیت کا یہ حال تھا کہ خود اپنے وجود کی وسعت و نوعیت کی خبر نہیں رکھتا تھا، وہ اس طرح باہمدگر علیحدگی اور بے رشتگی کی زندگی بسر کرتا تھا گویا ایک نوع کی جگہ مختلف انواع کے افراد ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کے علم و ادراک کی آنکھیں کھلنے لگیں وہ محسوس کرنے لگا کہ اپنے انفرادی وجود میں تنہا نہیں ہے۔ ایک ایسے مجموعہ کا فرد ہے جسکا ہر فرد اُسی کی طرح انسان ہے۔ لیکن چونکہ علم و احساس کی یہ رفتار قرب سے بُعد کی طرف تھی، اس لئے سب سے پہلے وہ رشتہ نمایاں ہوا جو سب سے زیادہ قریب تھا، اور سب سے آخر اس رشتہ کا سرا اُبھرا جو سب سے زیادہ دُور تھا۔ قرب و بعد کے ان دونوں کناروں کے درمیان جسقدر منزلیں پیش آئیں، اُن میں سے ہر منزل اپنی ماقبل منزل سے دُور تر لیکن مابعد منزل سے قریب تر تھی۔ انسانی ادراک و احساس کیلئے سب سے زیادہ قریبی اور سامنے کا رشتہ کیا تھا؟ ماں باپ کا رشتہ، اس لئے سب سے پہلے اُسی کا احساس بیدار ہوا۔ سب سے زیادہ دُور کا رشتہ کیا تھا؟ "انسانیۃ" اور "انسانی اخوت" کا رشتہ۔ اس لئے سب سے آخری اسی منزل کی نمود ہوئی۔

انسانی اخوت کا رشتہ دُور کا رشتہ اس لئے ہوا کہ یہ ایک غیر محدود کثرت کو وحدت میں

ہے اور انسانوں کی بڑی بڑی تعداد ان میں سمٹ آتی ہے۔

مذہبیت کے بعد اس سے بھی زیادہ وسیع دائرہ اس رشتہ کا پیدا ہو جاتا ہے جو جغرافیہ کی بڑی بڑی تقسیموں سے پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ایشیا، افریقہ، مشرق، مغرب۔ اس دائرہ میں پہنچکر انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ اس کے باہمی علائق کی دنیا وطن و جنس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ ایشیا کا باشندہ تمام ایشیا کو اپنا وطن سمجھنے لگتا ہے۔ اور یورپ کا باشندہ تمام براعظم یورپ میں اپنے لئے جذبۂ وطنیت محسوس کرتا ہے۔

جغرافیہ کی تقسیم پر پہنچکر اضافی وسعت کی تمام کڑیاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے۔ جو حقیقت کے عموم و اطلاق کی آخری منزل ہے اور جہاں پہنچکر یہ سلسلۂ ارتقا درجۂ بلوغ و تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ منزل "انسانیت" اور "اطلاقیت" کی منزل ہے۔ یہاں پہنچکر انسان محسوس کرتا ہے کہ رشتوں، علاقوں کی تمام حد بندیاں اور اضافی نسبتیں جو اس نے بنا رکھی تھیں، ان میں سے کوئی بھی حقیقی و فطری نہیں ہے۔ حقیقی رشتہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ تمام کرۂ ارضی انسان کا وطن ہے، تمام نسل انسانی ایک ہی گھرانے کے افراد ہیں اور ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے۔ اس منزل پر پہنچکر انسان کے اجتماعی علائق کا سفر ختم ہو جاتا ہے اور وحدۂ نسلی، وحدۂ مکانی اور وحدۂ جنسی کی جگہ فاطر السماوات والارض کی بنائی ہوئی ایک ہی وحدۂ انسانی اپنی کامل اور بے پردہ صورت میں آشکارا ہو جاتی ہے!

انسانی علم و معرفت کے سفر میں یہ منزل وحدت اور کل کی منزل ہے، اس کا ہر سفر جزو و فرد سے شروع ہوتا ہے، اور کل اور نوع کی وحدۃ پر ختم ہو جاتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تعین اور تسمیہ کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں، اضافت اور نسبت کی تمام تنگ نظریاں اور حد بندیاں دور ہو جاتی ہیں، اور عارف منزل شناس دیکھ لیتا ہے کہ اس کائنات کثرت میں حقیقت بجز وحدۃ کے اور کچھ نہیں، ہر گوشہ میں پہلے کثرت ہے، افراد ہیں، اجزاء

ہوگئی۔ نظرِ طفولیت کی نارسائی اس سے آگے نہیں دیکھ سکتی تھی یہ "عائلہ" کی منزل تھی پھر اُسکی عمر کچھ زیادہ ہوئی تو اپنے گھرانے اور خاندان کے تمام رشتہ داروں کو بھی جاننے پہچاننے لگا اگرچہ وہ اس کے گھر کی چار دیواری میں نہ رہتے ہوں۔ یہ وہی منزل ہے جسے پہلے "قبیلہ" کے نام سے پہچان چکے ہو۔ اس اثنا میں مسکن و مکان کا رشتہ بھی بوجہ قریبی ہونے کے دائرہ احساس و ادراک میں آجاتا ہے۔ پہلے اپنے ہمسایہ سے پھر اپنے محلے کے لوگوں سے، پھر پوری بستی اور شہر سے مانوس ہو جاتا ہے۔ یہ وہی منزل ہے جو "بلدیّہ" کے نام سے نوع کو پیش آچکی ہے۔

ان ابتدائی احساسات کے بعد وہ وقت آتا ہے جب طفولیت کا عہد ختم ہو جاتا ہے اور نظر ادراک اس حد تک نشو و نما پا لیتے ہیں۔ کہ مشاہدہ کی طرح سماع سے بھی علم و احساس حاصل کریں، تو تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اسکی ذہنیت اسی سانچے میں ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے جو انسان کی تمدنی زندگی نے پیدا کرلی ہے لیکن اب بھی احساس اجتماع کی رفتار وہی رہتی ہے جو قرب سے بُعد کی طرف ہونی چاہیئے۔ وہ اپنے دل میں پہلی کشش وطن کی طرف پاتا ہے۔ پھر قوم و جنس کا سر رشتہ کھینچتا ہے، سب سے آخر میں انسانیت آتی ہے اور اس کے دل کے دروازہ پر دستک دینے لگتی ہے!

اگر ایک بچّہ کو باقاعدہ تعلیم و تربیت کی ہوا نہ لگے، تو اس صورت میں بھی اسے ایسی ہی منزلیں پیش آئیں گی۔ البتہ بعض کڑیاں جو تہذیب و تمدن کے افکار و عقائد سے پیدا ہو گئی ہیں اس کے سامنے نہ آئیں۔ وہ قدرتی طور پر پہلے اپنے مولد و مسکن کا رشتہ محسوس کریگا پھر اطراف و جوانب کی طرف کھنچے گا۔ پھر اپنے ملک و اقلیم کا تصور کریگا، اور سب سے آخر دنیا اپنے رشتہ انسانیت کے ساتھ نمود کریگی!

(۲)

لاتقل دارہا بشرقی نجد ٭ کل نجد للعامریۃ دارا

لانے کے بعد نمایاں ہو سکتا تھا اور چونکہ ہمیشہ کثرت و تعداد کی وسعت میں انسانی عقل گم ہو جایا کرتی ہے، اس لئے وحدت تک پہنچتے پہنچتے اسے بہت دیر لگ جاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ کائنات ہستی وحدت و کثرت کی صورت آرائیوں کا ایک عجیب و غریب طلسم ہے، اس لئے جب کبھی کاروانِ عقل جستجوئے حقیقت میں نکلتا ہے، تو اُسے کثرت سے وحدت کی طرف بڑھنا پڑتا ہے، اور جب تک منزل بہ منزل پوری مسافت طے نہیں کر لیتا، حقیقت تک پہنچ نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ حقایق ہستی کے ہر گوشہ میں انسانی علم کی تاریخ ایک پوری داستانِ سیاحت ہے۔ درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل علم نے ترقی کی ہے اور جستجو نے سُراغ پایا ہے جس طرح انسان کو صرف اتنی بات معلوم کرنے کیلئے کہ ایک ہزار ہمشکل جانور ایک ہزار قسمیں نہیں ہیں، بے شمار زمانہ مطلوب تھا، اسی طرح وہ خود اپنے وجود کی نوعی وحدت اور اس کے عالمگیر رشتے کا علم و احساس بھی فوراً حاصل نہیں کر سکتا تھا ناگزیر تھا کہ ایک پوری مسافت منزل بہ منزل طے کی جائے۔ چنانچہ طے کی گئی، اور بالآخر وحدت انسانی کی منزل نمودار ہو گئی!

انسان کی حیات انفرادی

یہ انسان کی نوعی زندگی کی سرگزشت تھی اب کچھ دیر کیلئے اُسکی انفرادی زندگی پر بھی ایک نظر ڈال لو۔ نوعی زندگی کے علم کیلئے تاریخ کے اوراق اُلٹنے پڑے تھے، لیکن فرد کی زندگی کا صفحہ تو ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ یہاں بھی دیکھو کسطرح احساس اجتماع کا فطری سلسلہ ارتقا درجہ بدرجہ ظہور کرتا ہے اور منزل بہ منزل آگے لے جاتا ہے؟ جب ایک بچہ ماں کی گود میں آنکھیں کھولتا ہے تو ماں کے سوا اور کسی انسانی رشتے کا احساس نہیں رکھتا۔ پھر آہستہ آہستہ اُسکا ادراک اُبھرتا اور پھیلتا ہے، اور احساس کی وہ کڑیاں نمودار ہونے لگتی ہیں جو قرب سے بُعد کی طرف اُس کی رہنمائی کرتی ہیں۔ پہلے صرف ماں باپ ہی کے دامن سے لپٹتا تھا، یہ "امومۃ" اور "ابوۃ" کی ابتدائی کڑیاں تھیں۔ پھر اُس کے گھر کی چاردیواری اُسکی دُنیا

(۴) اس معاملہ کی پوری وضاحت کیلئے ضروری ہے کہ اسی قسم کی دوسری حالتیں بھی سامنے لائی جائیں۔ انسان نے صرف اپنے ہی کو نہیں بلکہ اپنے سے باہر کی بھی ہر چیز اسی طرح پائی ہے۔

اس نے پہلے زمین کے اس ٹکڑے کو سب کچھ سمجھا تھا جس میں پیدا ہوا تھا۔ اب بھی جب پیدا ہوتا ہے تو گھر کی چار دیواری ہی اس کی دنیا ہوتی ہے۔ اس نے زمین کی عام مخلوقات پر نظر ڈالی، اور ان میں سے ہر قسم اور نوع کو مدتوں کے بعد پہچان سکا۔ اسنے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، اور ہزاروں لاکھوں برس کے بعد یہ حقیقت معلوم کر سکا کہ سورج کا ایک نظام اجتماع ہے اور خود کرۂ ارضی بھی اسی کا ایک فرد ہے۔

علم و ادراک کے ان تمام سفروں میں انکی درمیانی منزلیں جو درجہ رکھتی ہیں، وہی قدر یہاں کی بھی درمیانی منزلوں کا ہے۔ زمین کے بارے میں انسانی علم کی ایک درمیانی منزل یہ تھی کہ آبادی صرف اس کے نصف حصہ میں ہے۔ باقی سمندر ہے۔ یہ منزل علم اور حقیقت کی منزل تھی، یا جہل اور محجوبیت کی؟ اگر علم اور حقیقت کی منزل نہ تھی، تو پھر بعینہٖ وطنیت اور جنسیت بھی اس سفر کی ویسی ہی درمیانی منزلیں ہیں۔ یہ انسان کے جہل و نقص کی منزلیں کیوں نہ ہوں؟ انسان نے جب پہلے پہل جہاز رانی شروع کی تھی تو (مثلاً) ہر سمندر کے گوشہ کو پانی کی ایک مستقل دنیا یقین کر لیا تھا اور ان کے بیشمار نام رکھدئے تھے۔ پھر ایک وقت آیا جب اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کے علم و نظر کی نا تمامی تھی۔ دراصل زمین کا سمندر ایک ہی ہے۔ اسی کے مختلف گوشے ہیں جو ادھر ادھر پھیل گئے ہیں۔ جب اس نے ایک سمندر کو پچاس سمندر خیال کیا تھا، تو یہ منزل علم و حقیقت کی منزل تھی، یا نقص و جہل کی تھی؟ تو انسانی احساس و اعتقاد کی وہ حالت کیوں جہل و نقص کی حالت نہ ہو جب وہ یقین کرتا ہے کہ انسانیت کا ایک ہی رشتۂ اجتماع، ایک ہی رشتہ اجتماع نہیں ہے پچاس ٹکڑے اور بے شمار قسمیں ہیں؟ بلاشبہ جس طرح زمین کے ایک حصہ کا علم د

انسان اپنی نوعی زندگی میں اپنے اجتماعی رشتوں کی مختلف منزلوں سے درجہ بدرجہ کیونکر گذرا؟ اسکی انفرادی زندگی میں آج بھی یہ تمام منزلیں کسطرح یکے بعد دیگرے پیش آتی ہیں؟ اسکی مختصر سرگزشت تمہاری نظروں سے گزر چکی۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ :-

(۱) قومیت اور وطنیت انسان کے اجتماعی رشتہ کی ایک خاص حالت کا نام ہے لیکن یہ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔ ایک سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے۔

(۲) یہ سلسلہ "انسان کی اجتماعی زندگی اور اجتماعی ربط و علاقہ کے احساس و اعتقاد" کا سلسلہ ہے۔ جس طرح کائنات ہستی کی ہر چیز اپنے ابتدائی نقطے سے شروع ہو کر بہ تدریج بلوغ و کمال تک پہنچتی ہے اور جس طرح انسان نے اپنے علم و عمل کے ہر گوشے میں بہ تدریج ترقی کر کے حقیقت و کمال تک رسائی حاصل کی ہے، اسی طرح اس معاملہ میں بھی اس کا سفر ابتدا سے انتہا تک، طفولیت سے رشد و بلوغ تک، اور نقص سے کمال تک پہنچا اور ختم ہوتا ہے۔ اس ارتقائی سلسلہ کی ابتدائی کڑی "امومۃ" اور انتہائی "انسانیۃ" ہے۔ جس رشتہ کو قومیت اور جنسیت سے آج تعبیر کیا جاتا ہے، وہ دراصل اس سلسلہ ارتقا کی ایک درمیانی کڑی ہے۔

(۳) چونکہ درمیانی کڑی ہے اس لئے وہ اجتماعی رشتہ کی کوئی حقیقی حالت نہیں ہے۔ محض ایک اضافی چیز ہے جس طرح ایک زمانے میں انسان نظر کی تنگی اور علم کی کوتاہی سے صرف "امومۃ" اور "ابوۃ" یا "عائلہ و قبیلہ" کے رشتہ پر قانع تھا، اسی طرح جب وسعت علائق کے ایک دو قدم اور آگے بڑھے، تو قومیت و جنسیت کا دائرہ پیدا ہو گیا۔ بلاشبہ یہ دائرہ پچھلے دائروں سے زیادہ وسیع ہے، لیکن فطرۃ کی حقیقی وسعت کے مقابلے میں تنگ اور ناتمام ہے۔ فطرۃ اور حقیقت کی اصلی وسعت کیا ہے؟ "انسانیت" اور "ارضیۃ" کا عالمگیر رشتہ یہی انسان کی اجتماعی زندگی کیلئے ایک ہی فطری رشتہ ہے۔ باقی سب اضافی، اور اسلئے غیر حقیقی ہیں۔

L2404

دُنیا کو جس طرف لیجانا چاہتا تھا، وہ کونسی منزل اور کونسا نقطہ ہے؟

وہ منزل "انسانیۃ" کی منزل ہے۔ وہ نقطہ اِس سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ کمال ہے!

چھٹی صدی عیسوی میں جب اسلام کا ظہور ہوا، تو دُنیا کے قدم "قبیلہ" اور "وطنیۃ" کی منزل سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا۔ اور عرب کی آبادی قبیلوں کا مجموعہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنی نسلی جنسیت کے دائرہ کے اندر محدود تھا، اور اُس سے باہر کی کوئی وسعت قبول نہیں کرتا تھا۔ اِن تنگ دائروں کے اعتقاد سے فخر و غرور، نسل انسانی کی تحقیر و تذلیل اور باہمدگر غلبہ و تسلط کے جس قدر مہلک جذبات پیدا ہوجایا کرتے ہیں۔ (جن کی تشریح آگے آئیگی) وہ سب کے سب اس شدت و قوت کے ساتھ اُن کے خمیر میں سرایت کر چکے تھے کہ شاید ہی کسی قوم کی تاریخ میں اُسکی نظیر مل سکے۔ اُن میں کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے انتساب سے بڑھ کر دُنیا کی کوئی عظمت و کبریائی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ سینکڑوں ہزاروں جانیں آن کی آن میں قربان ہوجاتی تھیں تاکہ قبیلہ کے شرف و غرور کو صدمہ نہ پہنچے۔ یہ معاملہ اِس درجہ معلوم و مسلم ہے کہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ حماسہ میں آج بھی انکے اشعار پڑھتے ہیں تو جذبات نسل و نسب کی شدت و حرارت سے دل و دماغ تنور کی طرح گرم ہوجاتا ہے۔ دنیا کی کسی قوم کی شاعری ان جذبات میں عرب جاہلیۃ کا مقابلہ نہیں کر سکتی!

عربی میں قبیلہ، خاندان، نسل اور مکان کی اِس حدبندی کے اعتقاد اور اس کے غلو کو "عصبیت" سے تعبیر کرتے تھے۔ اِس عصبیت کی پہلی بُنیاد عربیت پر تھی، یعنے غیر عرب کے مقابلہ میں عرب کی فضیلت، اور اس کے بعد عربیت میں بھی ہر قبیلہ اپنے نسلی امتیاز کے غرور سے سرگراں تھا۔

عرب سے باہر بھی دنیا کا تمام آباد حصہ قبیلہ اور وطن سے زیادہ وسیع دائرہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ رومی تمدن نے رومن قومیت کی بُنیادیں اُستوار کی تھیں لیکن

یقین، اُس حالت کے مقابلے میں جب انسان کو زمین کا اتنا علم بھی حاصل نہ تھا، علم کی وسعت تھی اور حقیقت سے قرب تھا۔ اُسی طرح یہاں بھی قومیت و جنسیت کی حالت اُس حالت کے مقابلہ میں جب انسان عائلہ اور قبیلہ کے تنگ دائروں پر قانع تھا، علم کی زیادہ وسعت اور حقیقت سے زیادہ قرب ہے، لیکن یہ ایک اضافی حالت ہوئی۔ علم اور حقیقت نہیں ہے۔ علم و حقیقت کی منزل اگر نمودار ہو جائے تو پھر وہ کمال کا نقطہ اور ارتقا کی انتہا ہوگی۔ اُس وقت کسی پچھلی منزل پر قانع رہنا ترقی نہیں ہوگی۔ تنزل ہوگا۔

اگر آج ایک شخص امریکہ کے وجود سے منکر ہو اور کہے کرہ کا صرف ایک ہی حصہ آباد ہے، تو تم کیا کہو گے؟ یقیناً یہی کہو گے کہ چھ سو برس پیشتر کا جہل قبول کرنے کیلئے دنیا طیار نہیں ہو سکتی۔

اچھا! تم اُس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو کہتا ہے کہ انسان کو نسل و مکان یا جنس و قوم کے رشتے پر قناعت کر لینی چاہیئے کیونکہ ایک زمانے میں اُس کا علم و ادراک انہی دائروں میں محدود تھا؟ تم نے ابھی کہا تھا کہ "دنیا چھ سو برس پیشتر کا جہل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں" کیا اب تمہیں ٹھیک اُسی طرح یہ نہیں کہدینا چاہیئے کہ "دنیا ہزاروں برس پیشتر کا جہل قبول کرنے کیلئے تیار نہیں"؟ کیسی عجیب بات ہے کہ تم ایک ہی چیز کو ایک جگہ ٹھکراتے ہو اور دوسری جگہ اپنے سر پر جگہ دیتے ہو؟ اس سے بھی بڑھ کر انسان کی عالمگیر غفلت و محجوبیت کا کوئی منظر ہو سکتا ہے کہ اُسے چھ سو برس پیچھے ہٹنے سے تو انکار ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ ہزاروں برس پیچھے دھکیل دیا جائے؟

(۳)

اسلام اور عصبیت قوم و جنس

اِن مقدمات کی تشریح کے بعد اب دیکھنا چاہیئے کہ اسلام نے اس بارے میں

ہے۔ اللہ کے حضور وہی سب سے زیادہ شریف ہے جو سب سے زیادہ اپنے کاموں میں پرہیزگار ہے"!

اس آیت کی ساری رُوح "لتعارفوا" کے لفظ میں ہے۔ اس لفظ نے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ انسانوں کے گروہوں اور جماعتوں کے جتنے بھی حلقے بنے ہیں، خواہ وہ نسل کی بنا پر بنے ہوں خواہ وطن و جنس کی بنا پر، ان کی ساری قدر و قیمت صرف اتنی ہے کہ باہم دگر پہچان کا ذریعہ ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی اثر نہیں رکھتے۔ تمام کرۂ ارضی پر پھیلی ہوئی نسلِ انسانی کیلئے ضروری تھا کہ مختلف حصوں اور گروہوں میں منقسم ہو جائے اور جب منقسم ہو گئی تو ناگزیر ہوا کہ ایک گروہ کو دوسرے سے پہچاننے کیلئے کوئی نہ کوئی ذریعہ تعارف پیدا ہو جائے۔ یہ تمام حلقے تعارف کا ذریعہ ہیں۔ یہ افریقی ہے، یہ عربی ہے یہ آرین ہے، یہ منگولین ہے۔ اس طرح ہر جماعت کی پہچان ہو جاتی ہے۔ لیکن اس تقسیم میں نہ تو کوئی امتیاز ہے، نہ یہ کوئی حقیقی تقسیم ہے۔ حقیقی امتیاز صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اور وہ انسان کی سعی و عمل کا امتیاز ہے۔

اب تمام نسلِ انسانی ایک سطح اور ایک صف میں کھڑی ہو گئی۔ حقیقت کسی کو بلندی نہیں دیتی، مگر اُس کو جو اپنے عمل سے شرف و رفعت کا استحقاق ثابت کر دے!

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے!

رشتۂ انسانیت کی وحدت و اخوت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کر دیا کہ "خلقنا کم من ذکر و انثیٰ" تمام نوعِ انسانی ایک ہی نسل، ایک ہی خاندان، ایک ہی گھرانا ہے۔ پس جب فی الحقیقت نہ تو نسل میں امتیاز ہوا کہ نسل ایک ہی ہے۔ نہ وطن میں تفریق ہوئی کہ وطن بھی سب کا ایک ہی کرۂ ارضی ہے، تو پھر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ سے کیوں الگ ہو؟ کیوں ایک ہی خاندان اور ایک ہی گھرانے کے رشتہ دار ایک دوسرے سے کٹ کر غیر اور اجنبی بن جائیں؟

اُس کی بُنیاد بھی نسل اور وطن ہی پر تھی سِسلی کے حاکم نے جب ایک رومانی کو گرفتار کر کے دُرّے سے پٹوایا تھا تو وہ اسکی ہر ضرب پر چیختا تھا "مَیں رُومانی ہوں" مشہور رومی خطیب سیسرو نے اِس حاکم کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "ایک رومانی فورم کے وسط میں لٹایا جاتا ہے اور دُرّے سے پیٹا جاتا ہے۔ وہ نہ تو درد و اذیت کی شکایت کرتا ہے۔ نہ روتا دھوتا ہے۔ صرف اِس جملہ کی تکرار کرتا ہے کہ مَیں رومانی ہوں اے مجلس قضاۃ! اس مظلوم کو یقین تھا کہ مَیں اپنے آپکو رومانی کہکر ساری تکلیفوں اور بے عزتیوں سے بچا لے سکتا ہوں۔ کیونکہ ابھی تھوڑے دِن کی بات ہے کہ رومانی ہونا کسی انسان کیلئے حفاظت اور شرف کی سب سے بڑی ضمانت تھی" یہ سیسرو کی قانونی تقریروں میں سب سے زیادہ فصیح تقریر تسلیم کی گئی ہے سیسرو نے صرف اسپر زور دیا کہ وہ رومانی تھا۔ یہ نہیں کہا کہ انسان تھا۔ اُسے انسانیت کا نہیں، رومانیت کا استغراق تھا!

لیکن اسلام اِن منزلوں میں رُک نہ سکا۔ اس نے اُن تمام رِشتوں اور رشتوں کی بُنیادوں سے انکار کر دیا جو انسان کے علم و نظر کی کوتاہیوں نے بنا رکھے تھے۔ نسل، وطن، جنس، رنگ، زبان، کسی غیر حقیقی رشتے کو تسلیم نہ کر سکا۔ اُس نے انسان کو صرف ایک ہی رشتے کی دعوت دی۔ انسانیت اور انسانی برادری کے فطری رشتہ کی!

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، ان اللہ علیم خبیر (۴۹ : ۱۳)

ترجمہ: اے مجمع انسانی! ہمنے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، پھر ایسا کیا کہ تمہیں مختلف شاخوں اور قبیلوں کی صورت دیدی۔ بہت سے گروہوں اور ملکوں میں بکھر گئے۔ لیکن شاخوں اور قبیلوں کا یہ اختلاف صرف اس لئے ہوا تاکہ ایک گروہ سے دوسرا گروہ پہچانا جا سکے۔ باقی رہی یہ بات کہ انسان کے شرف و عزت کا معیار کیا ہے۔ تو اسکی بُنیاد یہ طرح طرح کی گروہ بندیاں نہیں ہیں بلکہ انسان کی عملی زندگی

پانچ وقت کی نمازوں میں ثابت ہیں، اُن میں سے ایک دعا یہ ہے۔ زید بن ارقم نامی ایک راوی کہتے ہیں کہ آپ ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگتے تھے: (کان رسول اللّٰہ صلعم یقول فی دبر کل صلوٰۃ):

اللھم ربنا ورب کل شیء۔ انا شہید انک الرب وحدک لا شریک لک! اللھم ربنا ورب کل شیء، انا شہید ان محمدا عبدک ورسولک! اللھم ربنا ورب کل شیء، انا شہید اَن العباد کلھم اخوۃ (مسند امام احمد و ابو داؤد)

"خدایا! ہمارا اور ساری کائنات ہستی کا پروردگار! میں گواہ ہوں کہ صرف تو ہی پروردگار عالم ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ خدایا! ہمارا اور ساری کائنات ہستی کا پروردگار! میں گواہ ہوں کہ محمدؐ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ تیرا بندہ ہے اور تیرا رسول ہے! خدایا! ہمارا اور تمام کائنات ہستی کا پروردگار! میں گواہ ہوں کہ تیرے سارے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ انھوں نے کتنے ہی تفرقے پیدا کر رکھے ہوں لیکن تو نے اُن سب کو ایک ہی رشتۂ انسانیت میں جوڑ دیا ہے"!

غور کرو، اس دُعا میں یکے بعد دیگرے تین شہادتیں ہیں۔ پہلی پروردگار عالم کی توحید و ربوبیت کی ہے۔ دُوسری رسول کی رسالت اور بندگی کی ہے۔ یہ دونوں شہادتیں اسلام کے دینی عقائد کی بنیاد اور اولین اصول ہیں۔ اب ان دو اہم ترین عقیدوں کی شہادت کے ساتھ ہی تیسری شہادت جس بات کی دی جا رہی ہے ضروری ہے کہ وہ بھی اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اس درجہ اہم ہو کہ ان دونوں کے بعد تیسری جگہ پا سکے۔ وہ کیا ہے؟ "ان العباد کلھم اخوۃ" خدایا! اگرچہ انسان نے تیری بنائی ہوئی انسانی برادری چھوڑ کر طرح طرح کی نئی برادریاں اور رشتے بنا رکھے ہیں، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ جس طرح تیری وحدانیت اور تیرے رسول کی رسالت برحق ہے، اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ انہوں نے

اس بارے میں اسلام کی بُنیادی تصریحات اِس درجہ مشہور و معلوم ہیں کہ یہاں اُن کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مقصود صرف اشارہ ہے من جُملہ اُن قرآنی تصریحات کے جو انسانی وحدۃ کا اعلان کرتی ہیں، وہ تمام آیتیں ہیں جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مجمع انسانی کی اصل وحدۃ تھی۔ تفرقہ گمراہی اور فطرۃ الٰہی سے دُوری کا نتیجہ ہے۔

وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا، ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینھم فیما فیہ یختلفون (۱۹ : ۲۰)

اسلام کے داعی اول کی تعلیم اور عمل کا جو کچھ حال تھا، وہ بھی محتاج بیان نہیں آپ نے نسل و جنس کے غرور و تنگ نظری کو عصبیۃ جاہلیۃ سے تعبیر کیا اور بار بار اعلان کر دیا کہ "لیس منا من مات علی العصبیۃ۔ لیس منا من دعی الی العصبیۃ۔ لیس منا من قاتل علی العصبیۃ" یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کی خصوصیت کے تعصب پر دنیا سے جائے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کے تعصب کی طرف دعوت دے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی بنا پر کسی دوسری جماعت سے لڑائی لڑے حجۃ الوداع یعنی اُس حج کے موقعہ پر جو آپ کی زندگی کا آخری حج تھا، آخری خطبہ وصیت دیتے ہوئے فرمایا: "لا فضل لعربی علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی۔ کلکم ابناء آدم" (صحیحین) "لیس لاحد فضل علی احد الا بدین وتقویٰ الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب (رواہ الجماعۃ) آج کے دن سے نسل و قومیت کے سارے امتیازات مٹ گئے۔ اب نہ کسی عرب کو عرب ہونے کی وجہ سے عجمی پر فضیلت ہو سکتی ہے۔ نہ عجمی کو عربی پر۔ فضیلت اُسی کے لئے ہے جو اپنے عمل میں فضیلت رکھتا ہو تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور اِس لئے سب ایک ہی صف میں، اور ایک ہی درجہ کے ہیں!

اسلام کی دعوت میں انسانی وحدت و اخوۃ کی حقیقت کو کس درجہ اہمیت حاصل تھی؟ اسکا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ انحضرت (صلعم) سے جو دعائیں

اب غور کرو کہ اس دعاء میں جس طرح توحید اور رسالت کا اقرار لفظ "شہادت" کے ساتھ کیا گیا ہے، ٹھیک اُسی طرح انسانی برادری کی حقیقت پر بھی "شہادت" دی گئی ہے۔ اس سے تین باتیں واضح ہو گئیں:

اوّل یہ کہ اسلام کے نزدیک انسانی برادری کا قیام اس درجہ اہم تھا کہ اس کے اقرار کیلئے بھی "شہادت" کا لفظ اختیار کیا گیا جو اُس نے ایمان و عقائد کی بنیادی صداقتوں کے اقرار کیلئے مخصوص کر دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ ایک ایسی بات تھی جس کے لئے زیادہ سے زیادہ مضبوط یقین و ایمان مطلوب تھا۔ ایسا یقین جو ایک گواہ گواہی دیتے ہوئے کسی بات کی واقعیت پر رکھتا ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جو ہر طرف جھٹلائی جا رہی تھی۔ اور چونکہ جھٹلائی جا رہی تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ اس پر "گواہی" دی جائے اور اسکی گواہی ہمیشہ کے لئے قائم کر دی جائے۔

انسان کی عالمگیر اخوت کی راہ میں سب سے بڑی روک چار چیزیں تھیں، نسل، وطن۔ رنگت۔ زبان۔ انہی چار امتیازات کی بنا پر الگ الگ حلقے بنائے گئے تھے، اور انسانیت کا ایک دائرہ بے شمار چھوٹے چھوٹے دائروں میں بٹ گیا تھا۔ اسلام نے نہ صرف ان چاروں سے انکار کیا، بلکہ ان کے خلاف اس درجہ واضح اور قطعی اعلان کر دئے کہ کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ "نسل" کی نسبت صاف صاف کہدیا کہ سب کی نسل ایک ہی ہے۔ "وطن" کی نسبت کہدیا کہ عرب ہو یا عجم، سب ایک ہی خدا کی زمین کے باشندے ہیں۔ "زبان" اور "رنگت" کی نسبت فیصلہ کر دیا کہ یہ خدا کی حکمت و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کسی جگہ کی آب و ہوا ایک رنگ پیدا کرتی ہے۔ کہیں کی آب و ہوا دوسرا رنگ۔ کہیں ایک خاص طرح کی زبان ادائے مطلب

جہل و محجوبیت سے کتنا ہی یہ مقدس رشتہ بھلا دیا ہو، لیکن یہ رشتہ حقیقی ہے اور قائم ہے!

داعی اسلام توحید اور رسالت کے بعد جس حقیقت کا اعلان عام کرنا چاہتا تھا، وہ انسان کی انسانی برادری تھی!

اس موقعہ پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ قرآن و اسلام کی بولی میں "شہادت" کے لفظ کے ساتھ جب کسی عقیدے کا اظہار کیا جاتا ہے، تو اُسکی ایک خاص حیثیت ہوتی ہے۔ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ شہادت کے معنی گواہی دینے کے ہیں اور یہ اُسی وقت دی جاسکتی ہے جبکہ دو باتیں موجود ہوں:- ایک یہ کہ جس بات کی گواہی دیجائے، اُسپر گواہ کو پُورا پُورا یقین ہو۔ ایسا یقین جیسا اپنی آنکھ سے دیکھی بھالی چیز پر ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ کوئی ایسی بات ہو جسکی سچائی اور حقیقت پوشیدہ ہو گئی ہو اور دنیا میں عام طور پر اسے جھٹلایا جا رہا ہو، اس لئے ضرورت ہو کہ اس پر گواہی دیکر اُسے نمایاں اور عالم آشکارا کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اُس کے لئے "شہادت" کا لفظ موزوں نہ ہوگا۔ اظہار خیال کے دوسرے الفاظ کافی ہونگے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے "شہادت" کے لفظ کے ساتھ جن جن امور کا اعلان کیا ہے، وہ تمام تر وہی ہیں جو عقاید و ایمان کی بنیادی سچائیاں ہیں اور جن کی حقیقت انسان کے جہل و گمراہی سے اس درجہ پوشیدہ ہو گئی تھی کہ اُن کے جھٹلانے پر تمام دُنیا نے ایکا کر لیا تھا۔ ضرورت تھی کہ اُن کے لئے نوع انسانی کے دِل و زبان سے از سر نو گواہی دلوائی جائے۔ تاکہ ایک طرف اُن کے یقین و اعتقاد کا اعلان ہو جائے، دوسری طرف اُن کے جھٹلانے کی تکذیب ہو جائے۔ پھر اس شہادت کے بھی مراتب اور اقسام ہیں لیکن ان کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔

(۴) قرونِ وسطیٰ (مڈل ایجز) کے بعد یورپ کے تمدن کا نیا دَور شروع ہوا، اور اس نے قومیت و جنسیت کا صور اس زور سے پھونکا کہ تمام دُنیا اسکی صدائے باز گشت سے گونج اُٹھی۔ اب "النسانیۃ" کی راہ میں جنسیت و قومیت کی کڑی حائل ہوگئی ہے لیکن اسلام نے اب سے تیرہ سو برس پہلے یہ تمام کڑیاں طے کر لی تھیں

(۵) اگر کہا جائے کہ اسلام کی دعوت سے بھی النسانیت کا عام حلقہ پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ "اسلامیت" کا ایک نیا حلقہ بنگیا، تو یہ صحیح ہے لیکن چند حقیقتیں تسلیم کرنی پڑیں گی،

اولاً یہ قصور زمانے کی استعداد کا ہے نہ کہ اسلام کی دعوت کا۔ مختلف وجوہ سے جن کی تشریح آگے آئیگی دُنیا کو عملاً منزل النسانیت تک پہنچنے کیلئے ابھی بڑا وقت درکار تھا۔

ثانیاً اگرچہ "اسلامیت" کا ایک نیا حلقہ پیدا ہوگیا مگر کیسا وسیع حلقہ؟ ایسا وسیع حلقہ کہ اسوقت تک کے تمام اجتماعی حلقوں میں سب سے زیادہ وسیع حلقہ وہی ہے بلا شبہ وہ بھی ایک چار دیواری کھینچ دینے پر مجبور ہوگیا، لیکن کیسی چار دیواری؟ اس درجہ وسیع چار دیواری کہ دُنیا کے تمام بنائے ہوئے احاطے اس کے پھیلاؤ کے اندر آگئے۔ اُس نے کسی گوشے کسی دائرے کسی ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کو بھی اپنی چار دیواری سے باہر رہنے نہیں دیا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اسلام کی دعوت نے النسانی اجتماع کا ایک ایسا دائرہ پیدا کر دیا جو نوعِ النسانی کے تمام پچھلے دائروں سے اوپر اور صرف ایک ہی دائرہ مطلقۂ النسانیۃ سے نیچے ہے۔ وہ انسان کو تمام نچلے درجوں سے بلند کر کے ایک ایسی سطح تک پہونچا دیتا ہے جہاں سے "النسانیت" کی آخری بلندی صرف ایک درجہ بلند ہے۔ وہ دنیا کے قدم اُس سطح تک پہنچا دیتا ہے۔ جہاں صرف ایک قدم آگے بڑھنا رہجاتا ہے۔ حالانکہ دُنیا کی تمام قوموں کے لئے

کے لئے وجود میں آگئی۔ کہیں دوسری زبان لیکن یہ اختلافات انسان کے امتیاز اور تفرقہ کی بنیادیں نہیں ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے اعمال کا جو نظام طیار کیا، اُس کے ہر گوشہ کی وضع قطع ایسی رکھی، جس کے ساتھ امتیاز نسل و قوم جمع ہی نہیں ہوسکتا روزانہ اعمال و عبادات میں ایسی چیزیں رکھ دی گئیں کہ ہمیشہ انسانی وحدت و مساوات کا عملی اعتراف ہوتا رہے، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سب میں یہ روح کام کر رہی ہے۔ انسانی اخوۃ کے کام و نفوذ کا ایک پورا انتظام ہے جو اپنے ہر فرد کو مجبور کر دیتا ہے کہ اس حقیقت کا اقرار کرے، اُس کے سامنے سر اطاعت خم کر دے، اس کے یقین و ایمان کی عملی تصویر بنجائے!

اس بارے میں بیشمار چیزیں کھولنے اور بیان کرنے کی ہیں لیکن یہاں یہ ذکر ضمناً آگیا ہے، اسلئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔

اسلام کو اپنی اس دعوت میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ انسانی برادری کا گم گشتہ حلقہ قائم ہوگیا یا نہیں؟ اسکا مفصل بیان آگے آئیگا۔ لیکن تاریخ اور مشاہدہ کا یہ فیصلہ تو بلا نزاع مسلم ہے کہ:

(۱) عرب کی نسلی اور وطنی عصبیت پر ایسی کاری ضرب لگی کہ پھر سر نہ اٹھا سکی۔

(۲) عرب سے باہر وہ جہاں جہاں پہنچا، ایک ایسی انسانی اخوۃ کی دعوت جو وطنی اور نسلی امتیازات سے بالاتر تھی، اُس کے ساتھ ساتھ گئی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جب یورپ کی اجتماعی زندگی "عائلہ" اور "قبیلہ" کی سرحد سے آگے نہیں بڑھی تھی، اسلام اسپین اور فرانس میں انسانی اخوۃ کا پیغام سُنا رہا تھا!

(۳) اُس نے ایک ایسا عالمگیر معاشرتی نظام قائم کر دیا جو ہر طرح کے نسلی و وطنی تعصبات سے بالاتر ہے، اور جس کی بنیاد انسانی اخوۃ اور وحدۃ پر ہے۔

ہے۔ پہلے انسانوں کی ایک جماعت وطنیت اور قومیت کا دائرہ اسلئے کھینچتی ہے۔ تاکہ اُس کے اندر رہکر دوسروں کے حملوں سے اپنی حفاظت کرے، یہ قومیت "دفاعی قومیت" ہوتی ہے۔ لیکن جب کچھ عرصہ تک یہ دائرہ قائم رہتا ہے تو پھر قومی حفاظت کی جگہ قومی برتری اور وطنی گھمنڈ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور "دفاعی قومیت" اچانک "ہجومی قومیت" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب قومیت اپنا بچاؤ ہی نہیں چاہتی۔ دُوسروں پر حملہ کرنا بھی چاہتی ہے۔ ساتھ ہی نسلی اور قومی برتری کا نشہ دوسرے انسانوں سے علیحدگی اور انکی تحقیر و تذلیل کے جذبات بھی برانگیختہ کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مختلف قومی حلقوں میں باہمدگر تصادم شروع ہو جاتا ہے، اور انسانیت کے تمام اعلےٰ جذبات افسردہ ہو کر رہجاتے ہیں۔

اس صورت حال کا علاج صرف یہی تھا کہ حتی الامکان تنگ دائروں کا قیام ہی روک دیا جائے۔ جب کبھی کوئی تنگ دائرہ بنے گا، تو چونکہ یہ حقیقی انسانی دائرہ کی وسعت میں قطع و برید ہوگی، اس لئے ضروری ہے کہ وسعت نظر و احساس کی جگہ تنگی نظر و ضیق صدر کی بُنیادیں پڑ جائیں۔ اسلام نے اسی لئے ان تمام تنگ دائروں کی ہمت افزائی کرنے سے انکار کر دیا، لیکن افسوس ہے کہ دنیا اتنی بلند نہیں ہوئی تھی کہ اس وسعت نظر کی متحمل ہو سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کا ایک ایسا دائرہ تو بنگیا جو تمام پچھلے دائروں سے زیادہ وسیع ہے لیکن نوع انسانی کی حدبندیاں نہ ٹوٹ سکیں!

وطنی و نسلی عصبیت کی اگر تحلیل کی جائے تو تین چیزیں ایسی نکلیں گی جنھیں خاص خاص لفظوں میں تعبیر کر کے بتلا دیا جا سکتا ہے کہ اس عصبیت کے عناصر کیا کیا ہیں:۔

(۱) جماعتی تنگ نظری۔

"جماعتی تنگ نظری" سے مقصود یہ ہے کہ جب انسانوں کا کوئی گروہ دوسروں

ابھی منزلوں کی منزلیں باقی ہیں!

اس اعتبار سے اگر رشتۂ اجتماع کی تمام کڑیوں پر دوبارہ نظر ڈالی جائے، تو اُن میں ایک نئی کڑی ساری کڑیوں سے اوپر مگر آخری "النسانیۃ وارضیۃ" سے نیچے بڑھا دینی پڑیگی، اور اس سلسلۂ ارتقا کی نو منزلوں کی جگہ دس منزلیں بنجائینگی:

(۱) اموّمۃ
(۲) ابوّۃ
(۳) عائلہ
(۴) قبیلہ
(۵) بلدیّۃ
(۶) وطنیّۃ
(۷) قومیت و جنسیت
(۸) براعظمیت یا تقسیم بہ لحاظ جغرافیہ
(۹) اسلامیت
(۱۰) النسانیۃ وارضیۃ

"اسلامیت" کی سرحد "النسانیۃ" کی سرحد سے متصل ہے اگر دنیا چاہے تو صرف ایک قدم میں منزلِ مقصود تک پہنچ جاسکتی ہے!

عصبیت نسل و وطن

اسلام کی دعوت "انسانیت" اور "انسانی برادری" کی دعوت تھی۔ اسلئے اُس کا رجحان ان تمام تعصّبات کے خلاف تھا جو نسل و وطن کے امتیازات سے پیدا ہوگئے تھے۔ اسلئے ضروری ہے کہ مختصراً عصبیت نسل و وطن کی بھی تشریح کردی جائے۔ تاکہ واضح ہوجائے کہ اسلام کی روح جس چیز کی مخالف ہے۔ وہ صاف اور معین صورت میں کیا ہے؟

دو چیزیں ہیں، ایک نسل و وطن کا تحفّظ ہے۔ ایک نسل و وطن کا تعصّب ہے۔ اسلام کی روح تعصّب کی مخالف ہے۔ تحفّظ کی مخالف نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جب کبھی کوئی اس طرح کا دائرہ بنتا ہے، تو گو اس کی ابتدا تحفظ کے جذبات سے ہوتی ہے، لیکن آگے چلکر تحفظ تعصّب کی شکل اختیار کرلیتا

کا معیار قایم ہو جاتا ہے۔ اس کے قدیم نمونے عرب جاہلیت کے غرورِ نسب اور ہندوستان کے برہمنوں کے نسلی گھمنڈ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نئے نمونے یورپ کی قومیتوں اور عصبیتوں کی شکل میں دنیا کے سامنے ہیں۔ علم، استغنا اور مساوات کی اس سب سے بڑی صدی میں بھی ایک انگریز سب سے پہلے انگریز ہونے کو اور ایک امریکن سب سے پہلے امریکن ہونے پر نظر رکھتا ہے!

البتہ یاد رہے کہ "غرور" اور "خودداری" میں فرق ہے۔ جماعت اور فرد دونوں کے لئے مذموم غرور و کبر ہے۔ خودداری نہیں ہے۔

(۳) جماعتی برتری کا غلو۔

تیسری چیز وہ ہے جسے "جماعتی برتری کے غلو" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ جب ایک دائرہ وطنیت اور قومیت کا بن جاتا ہے، تو آہستہ آہستہ اس میں قومی برتری کے جذبات نشو و نما پانے لگتے ہیں۔ ایک خاص حد تک تو ان میں غلو نہیں ہوتا، لیکن جب اس حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں، تو پھر قومی گھمنڈ اور کبریائی کا ایک جنون ہوتا ہے جس کے نشہ سے قوم کا ہر فرد متوالا ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے نوع انسانی کا ہر فرد اسکی قومی برتری کے سامنے سربسجود ہو جائے اور زمین کا ہر ٹکڑا اس کے قدموں سے پامال ہو۔ اسکی حرص غیر محدود اور اس کے قومی مطامع لاامتناعی ہوتے ہیں۔ رومیوں نے ساری دنیا کو دو قسموں میں بانٹ دیا تھا، حاکم اور محکوم۔ وہ صرف اپنے کو حاکم قوم سمجھتے۔ باقی ساری دنیا محکومیت کیلئے تھی۔ نپولین کی پے در پے لڑائیوں نے فرانس کی آبادیاں جوان مردوں سے خالی کر دیں۔ اس کی عالمگیر اولوالعزمیوں کی وجہ سے تمام یورپ فرانس کا دشمن ہو گیا۔ تاہم نپولین جو جماعتی دماغ کے بھیدوں کا سب سے بڑا انباآمن تھا، جب کبھی عوام کے سامنے آتا اور نعرہ لگاتا "فرانس کی عظمت، فرانس کا جھنڈا، فرانس کے جھنڈے کے تین رنگ" تو فرانس اپنی ساری بربادیاں اور

سے الگ ہوکر ایک چھوٹے سے دائرہ کے اندر محصور ہو جاتا ہے، تو اس کا دل تنگ، نظر محدود، اور ظرف کوتاہ ہو جاتا ہے اُس کی ذہنیت ایک محدود گوشے کے اندر سکڑ کے رہجاتی ہے۔ اُس کا جماعتی دماغ نظر کی وسعت، حوصلہ کی فراخی، اور ارادوں کی بلندی پیدا نہیں کر سکتا۔ زندگی اور زندگی کے ہر گوشہ میں پیمانۂ فکر وسعت سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔ انسانی ہمدردی کے جذبات بھی نہایت تنگ اور محدود ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے کو اور اپنے تنگ گوشے ہی کو دیکھتا رہتا ہے۔ اُس سے باہر کا کوئی اثر قبول نہیں کر سکتا۔ وہ انسان ہونے پر بھی نوعِ انسانی سے الگ رہنا چاہتا ہے اُس میں اور انسانیت میں ایک ناقابل عبور دیوار کھنچ جاتی ہے!

جماعتی مزاج کی اس حالت کا اندازہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ واضح مثال ہندوستان کی ہم ذاتوں کا نظام (کاسٹ سسٹم) ہے یہ دُنیا کے اُس عہد کی سب سے زیادہ طاقتور اور دیرپا یادگار ہے جب اُس کے قدم "قبیلہ" کی منزل میں جم چکے تھے۔ "قبیلہ" کی حد بندی کو منو نے ذات کی تقسیم میں منقسم کر دیا، اور جماعتی حد بندی کی حفاظت کیلئے اُن کے الگ الگ کام اور پیشے قرار دے دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ "انسانیت" کے تمام اعلیٰ جذبات فنا ہو گئے، اور حلقہ بندی کی ساری تنگ نظریاں اپنی انتہائی حالت میں پیدا ہو گئیں۔ اب دُنیا منو کے عہد سے ہزارہا برس آگے بڑھ چکی ہے لیکن ہندوستان اب بھی طیار نہیں ہے کہ اِن حد بندیوں کی سرحد عبور کر کے انسانیت کی وسعت کی طرف قدم اٹھائے!

(۲) نسلی اور وطنی غرور و کبر

دوسری چیز نسلی اور وطنی بڑائی کا گھمنڈ ہے اور اس سے بڑھکر انسانیت اور انسانی حقوق کیلئے کوئی جذبہ مہلک نہیں۔ یہ اعتقاد اور عمل کے تمام گوشے پامال کر دیتا ہے انسانیت، عمل، استعداد، اور حق کی جگہ ایک غیر طبعی معیارِ فضیلت یعنی نسل اور وطن

"قومیت" اپنے سادہ معنوں میں اگرچہ پہلے سے موجود تھی، لیکن موجودہ زمانے میں "قومیت" کے لفظ سے جن اجتماعی عقائد و جذبات کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے، یہ دراصل یورپ کے نئے عہدِ تمدن کی پیداوار ہے۔ اسکی پیدائش انسانی آزادی وحقوق کی حفاظت کیلئے ہوئی تھی، لیکن اب انسان کی آزادی وحقوق کیلئے یہی چیز سب سے بڑی مصیبت بنگئی ہے!

دفاعی قومیت کی پیدائش

ازمنۂ وسطیٰ (مڈل ایجز) کے بعد جب یورپ نے کروٹ بدلی اور نئے تمدن کی نشو و نما شروع ہوئی، تو اُس کے ساتھ ساتھ ایک نئے قسم کی اجتماعی زندگی بھی نشو و نما پانے لگی۔ یہ وہ وقت تھا، جب ایک طرف علم اور آزادی کی رُوح تمام یورپ میں پھیل رہی تھی۔ دوسری طرف شخصی حکومتوں کا استبداد اور اجنبی تسلط کا ظلم اپنی تمام پرانی روایتوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک طرف شاہی تاج و تخت اور اس کے غیر محدود دعوے تھے۔ دوسری طرف علم و آزادی کے پیدا کئے ہوئے نئے نئے اصول اور نئے نئے ولولے تھے۔ تاج و تخت کے مقابلے میں جب عوام کے جذباتِ آزادی جوش میں آگئے تو خود بخود ایک نہایت مؤثر اور طاقتور لفظ وجود میں آگیا۔ یہ لفظ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن اس کے ساحرانہ معانی لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ اب ہر شخص کے سامنے آگئے۔ یہ لفظ "قوم" تھا، اور یہ انکشاف "قوم ہونے" یعنے "قومیت" کا انکشاف تھا۔ شاہی تاج و تخت کا دعویٰ تھا جیسا کہ بدنصیب لوئیس شانزدہم نے بعد کو کہا: "حق اور طاقت میں ہوں" عوام اب اسے تسلیم کرنے کیلئے طیار نہ تھے۔ خود بخود سوال پیدا ہو گیا کہ اگر شاہی نسل اور تاج و تخت کی وارثت، حق اور طاقت کا جائز سرچشمہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ وہ کونسی قوت ہے جس کے سامنے شاہی تخت و تاج کو بھی سر جھکا دینا

خونریزیاں بھول جاتا اور وطنیۃ کے جنوں سے بیخود ہو کر پکارنے لگتا "زندہ باد فرانس" اتنا ہی نہیں بلکہ قومی اور وطنی گھمنڈ کے اس نشہ میں وہ یہ بھی بھول جاتا کہ جس شاہی استبداد سے نجات پانے کیلئے اس نے ہزاروں فرانسیسوں کے سر گلوٹین کی چھری سے جدا کر دیئے تھے، وہی استبداد آج نپولین کی شخصیت میں ایک درجہ اور شدید ہو کر موجود ہو گیا ہے، اور شاہی کی جگہ "شہنشاہی" اس پر مسلط ہے۔ وہ دیوانہ وار پکارتا "زندہ باد شہنشاہ"!

نیٹشے اور برن ہارڈی نے جرمنی کو "حاکم قومیت" اور "محکوم دنیا" کا جو جام پلایا تھا، اس کی سیہ مستیاں بھی دنیا دیکھ چکی ہے۔ "دنیا میں سب سے بڑی قوم جرمن کو ہونا چاہیئے یا برطانیہ کو؟" اس سوال نے ۵ برس تک تمام کرۂ ارضی کو خون اور آگ کے حوالے کر دیا۔ آج "برطانی شہنشاہیت" کا بے پناہ جذبہ دنیا کی کسی قوم کو سر اٹھانے نہیں دیتا سب کو پامال اور سربسجود دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ بھی وہی قومی برتری کا غلو اور جنون ہے۔ "قومیت" کا وہی حلقہ جو کبھی اس لئے بنا تھا تاکہ اپنی حفاظت کرے اب اس لئے باقی ہے تاکہ دنیا کی کسی قوم اور ملک کے لئے حفاظت باقی نہ رہے!

اسلام کی دعوت جس عصبیت کی مخالف تھی اور جسے اس نے "عصبیۃ الجاہلیۃ" سے تعبیر کیا، وہ یہ عصبیت ہے اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس نے "وطنیۃ" اور "قومیت" کی جس حالت سے اختلاف کیا، وہ وہی حالت ہے جب دفاع اور تحفظ کی جگہ ہجوم اور تعصب کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ البتہ چونکہ اصل بنیاد اس حالت کی یہی ہے کہ انسانیت کے وسیع رشتے کی جگہ تنگ اور محدود دائروں کا پیدا ہو جانا، اس لئے اس کی ذہنیت کا عام رجحان اسی طرف رہا کہ سرے سے تنگ دائرے وجود ہی میں نہ آئیں۔

(۴)

یورپ کی جدید قومیت

عقدِ اجتماعی Social Contract دُنیا کے جدید جمہوری عہد کا اولین صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب جب لکھی گئی تھی، تو لوگ اس کی خیالی نقشہ آرائیوں پر ہنستے تھے، لیکن کارلائل کے تاریخی اور ضرب المثل لفظوں میں جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا تو اُس کی جلد باندھنے کیلئے ان لوگوں کا چمڑا استعمال میں لایا گیا، جنھوں نے اسکی ہنسی اڑائی تھی!

روسو نے انسانی آزادی و حقوق کا نقشہ کھینچتے ہوئے قوم اور قومیت کے بھی خال و خط آراستہ کئے ہیں۔ وہ انسان کی انفرادی آزادی کے اعتقاد کے ساتھ "قوم" کا حلقۂ ارتباط بھی قائم کرتا ہے اور اسے ایک معاشرتی معاہدہ سے تعبیر کرتا ہے وہ کہتا ہے سوسائٹی کا ہر فرد آزاد ہے اور تمام افراد کے حقوق مساوی ہیں، لیکن.. سوسائٹی کا انتظام قایم رکھنے کے لئے ایک منظم حلقہ کی ضرورت ہے۔ یہ حلقہ قومی نظام کا حلقہ ہے "قوم" اور "قوم ہونا" ہی وہ تنہا نظام ہے جسے حکم اور نظم کی ساری قوتیں حاصل ہونی چاہئیں۔ اسمیں شک نہیں کہ روسو نے جس آزاد نظام معاشرت اور دُنیا کے "آزاد اور روشن عہد" کا خواب دیکھا تھا، اُسکی تعبیر دُنیا کو نہیں ملی، لیکن اُس کے "قومیت" اور "جمہوریت" کے اصول دنیا نے بغیر کسی تامل کے قبول کر لئے، اور پھر انقلاب فرانس کا وہ خونیں سیلاب نمودار ہوا جو عہد قدیم کے تمام شخصی اور شاہی اصول و عقاید بہا لے گیا!

گذشتہ دو صدیوں سے دُنیا "قومیت" کے انہی بنیادی اصول پر گامزن ہے۔

جدید "قومیت" کے مبادیات

یہ جدید "قومیت" جن مبادیات اور عقاید پر قائم ہوئی، اس کے اصول حسب ذیل ہیں:-

(۱) باشندوں کا جو گروہ کسی خاص جغرافیائی حدود کے اندر، نسل، یا وطن، یا زبان، یا معاشرت کی یگانگت کی بنا پر آباد ہے، جب اُس کے افراد اپنے آپکو ایک "قوم"

چاہیئے؟ خود بخود جواب پیدا ہوگیا کہ "قوم" ہے۔ صرف "قوم" ہی ہر طرح کے حق و طاقت کا سر چشمہ ہے۔ صرف "قوم" ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے اوپر حکومت کرے!

"رعیّت اور قوم"

اُسوقت تک عوام کا اعتقاد یہ تھا کہ طاقت کا مرکز شاہی تاج و تخت ہے۔ اب طاقت کا ایک نیا مرکز نمودار ہوگیا جو خود اُسی کے اندر پوشیدہ تھا مگر اُسے خبر نہ تھی۔ یہ "قوم" اور "قوم ہونے" کی طاقت تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یکایک صورت حال میں ایک عظیم انقلاب ہوگیا۔ یعنی "رعیت" کی جگہ "قومیت" نے لے لی۔ اب عوام "رعیت" نہ تھے۔ "قوم" تھے۔ جب تک وہ "رعیت" تھے، ساری قوت شاہی و شاہیت میں مرتکز تھی۔ اب وہ "قوم" ہو گئے تو ساری قوت اُنہی میں سمٹ آئی۔ صرف اتنی تبدیلی نے دُنیا کی اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ بدل دیا۔ کارلائل CARLYLE کے بلاغت طراز لفظوں میں "رعیت کا قوم ہو جانا دنیا کا ایک ہی مرتبہ اُلٹ پلٹ ہو جانا تھا۔ زبانوں کا کوئی لفظ بھی اُس انقلاب حال کی تعبیر نہیں کر سکتا جو صرف اِن دو سادہ لفظوں کے اَدل بَدل ہو جانے سے نوعِ انسانی کی تاریخ میں پیدا ہوگیا!"

دُنیا میں صرف انسان ہی پیدا نہیں ہوتے۔ الفاظ بھی پیدا ہوتے ہیں، اور جس طرح ایک عظیم انسان کی پیدائش دنیا کے انقلاب کی پیدائش ہوتی ہے، اُسی طرح بعض عظیم لفظوں کی پیدائش میں بھی عظیم انقلاب مضمر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ لفظ "قوم" کی پیدائش تاریخ کا انقلاب عظیم تھا، لیکن اگر کارلائل چند قدم آگے بڑھ سکتا تو دیکھتا کہ دنیا کا سب سے بڑا انقلاب لفظ "قوم" کی پیدائش نہیں بلکہ "انسان" کی پیدائش میں مضمر ہے۔ کون ہے جو اُس انقلاب کی عظمت کا نقشہ کھینچ سکتا ہے؟

جن ہاتھوں نے انقلاب فرانس کی ابتدائی تخم ریزی کی، ان میں والٹیر Voltaire اور Rousseau سب سے آگے ہیں۔ روسو کی کتاب

سامنے آئیں گی۔

(۱) "انسانی آزادی" اور "قومی حقوق" کے مبادیات نسبتہً قائم ہو گئے اور اُن کی وجہ سے یورپ کے ذہن و اجتماع کا انقلاب عظیم وجود میں آگیا۔ جدید "قومیت" کے اصول و عقاید نے جماعتوں کے اندر ایک ایسی نئی اجتماعی طاقت پیدا کر دی جو تمام پچھلی اجتماعی طاقتوں سے زیادہ منظم اور قوی تھی۔

(۲) قومیت کے نشو و نما سے پہلے یورپ مذہبی تعصبات میں مبتلا تھا۔ مسیحیت کی مذہبی جکڑ بندیاں اتنی سخت تھیں کہ ذہن و دماغ کو ہلنے نہیں دیتی تھیں۔ اب "قومیت" کے فروغ نے مذہب کے تعصبات دھیمے کر دیئے۔ مذہب کی جگہ "قومیت" اجتماع و ارتباط کا رشتہ بن گئی۔ قومیت نے جب سر اٹھایا تھا تو اُسے شاہی استبداد سے کہیں زیادہ پوپ اور کلیسا کے استبداد کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ والٹیر نے بیت المقدس کی جگہ انسانی آزادی کیلئے جنگ مقدس (کروسیڈ) کا اعلان کیا تھا۔ جب اس معرکہ میں قومیت فتحمند ہوئی تو یہ فتح شاہی اور کلیسائی، دونوں طرح کے استبدادوں پر فتح تھی۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قومیت جڑ پکڑتی جاتی تھی، اور مسیحی جمود اُکھڑتا جاتا تھا۔

(۳) "قومیت" کے فروغ سے پہلے یورپ ذہن و اعتقاد کے جن دائروں میں بند تھا، وہ حد درجہ تنگ تھے۔ اس لئے قومیت نے پچھلے دائروں سے ایک زیادہ وسیع دائرہ مہیا کر دیا، اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گوشۂ فکر و عمل میں ایک ایسی وسعت پیدا ہو گئی جس کا اس سے پہلے وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۴) مذہبی اور نسلی تعصبات کی جگہ "قومیت" کے قائم ہو جانے کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے اندر تمام جماعتیں اور تمام طبقات باہمدگر متحد اور منسلک ہو گئے۔ یہ احساس کہ "فلاں انسان ہمارا ہم قوم اور ہم وطن ہے" اتنا قوی اور موثر ہو گیا کہ

کے خطوط میں داخل ہوگئیں۔

لیکن اِس کے بعد کیا ہوا؟ کیا انسانی، آزادی و حقوق کے وہ تمام اصول جو اِن قومیتوں کا مایۂ خمیر تھے، دنیا میں قائم ہوگئے؟ کیا امریکہ کے "اعلانِ آزادی" اور انقلاب فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" کے مبادیات نے دُنیا کی تمام قوموں کے لئے حق و آزادی کی نعمت مہیا کردی؟ کیا واقعی طاقت کی جگہ حق کا اور استبداد کی جگہ آزادی کا دعویٰ تسلیم کرلیا گیا؟

دُنیا نے حیرت و دہشت کے ساتھ دیکھا کہ اِن میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ وہی "قومیتیں" جو انسان کے انفرادی و قومی حقوق کی حفاظت اور دفاع کے لئے وجود میں آئی تھیں، کچھ دنوں کے بعد انسانی آزادی و حقوق کی پامالی و اتلاف کا ذریعہ ہوگئیں۔ اُن کی ابتداء "دفاعی قومیت" سے ہوئی تھی لیکن اُن کا ظہور "ہجومی قومیت" کی شکل میں ہُوا۔ جماعتی تنگ نظری، وطنی غرور و کبر، اور قومی برتری و اقتدار کے تمام جذبات اُبھر آئے، اور انسانی آزادی و حقوق کے مبادیات و اصول اِس لئے رہ گئے کہ ہر قوم صرف اپنے لئے اُنکا نفاذ چاہیئے، اور اپنے سوا سبکو اُن سے محروم دیکھے!

یہ وہی "وطنی و قومی عصبیۃ" کی جاہلت ہے جسکی تشریح اُوپر گزر چکی ہے۔ یہ قومیت کا تحفظ نہیں ہے۔ قومیت کا تعصب ہے۔ یہ "انسانیت" اور "انسانی برادری" کے عین ضد ہے۔ یہ "انسانی آزادی و حقوق" کے اعتقاد کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ یہ آزادی کے نام سے آزادی کی پامالی، اور قومیت کے نام سے صرف طاقت کی معبودیت ہے!

نئی قومیت کے محاسن و مفاسد

اگر یورپ کی قومیتوں اور ان کے اعمال پر نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل حقیقتیں

کہ اسی آزادی کی امیر عبدالقادر جزائری اور اس کی بدبخت قوم کو بھی ضرورت ہے یا نہیں جسے فرانس نے اپنی فوجی طاقت سے غلام بننے پر مجبور کر دیا ہے؟ آج فرانس کی معلم "حریت" "قومیت" شام میں جو کچھ کر رہی ہے، دنیا کے سامنے ہے۔ انگلستان کہتا ہے وہ چھوٹی قوموں کا محافظ ہے آزادی کا پشت پناہ ہے۔ محب الوطنوں کے لئے گوشۂ امن ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کن حالات میں اور کن کے لئے ہے؟ بلاشبہ اُس نے رُوس کے فراریوں کو پناہ دی، فرانس کے جلاوطنوں کے لئے دروازے کھول دئے، یونان کی آزادی کیلئے اپنا قومی شاعر بائرن پیدا کر دیا، اٹلی کے میزینی کو اپنی آبادیوں میں جگہ دیدی، اور یورپ کے بیشمار انقلابی نقشے لندن کی گلیوں اور مکانوں ہی میں کھینچے گئے؛ مگر مشرق اور ایشیا کے لئے اسکی یہ "حریت پرور" قومیت کیا فیصلہ کرتی رہی؟ وہ روس اور آسٹریا کے مظلوموں کو پناہ دیتا رہا، لیکن خود اُس کے ظلم و تسلط کے مظلوموں کیلئے اُس کے پاس پناہ دینے کا کیا سامان تھا؟ جواب کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آج مشرق اور ایشیا کا ہر گوشہ زبان حال سے جواب دے رہا ہے!

(۳) چونکہ "دفاعی قومیت" کی جگہ "ہجومی قومیت" کا جماعتی مزاج پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے خود یورپ کو بھی اپنی "قومی عصبیت" کے نتائج سے نجات نہ مل سکی۔ بلاشبہ غیر یورپین اقوام و بلاد کے مقابلہ میں اُس نے اپنے لئے آزادی و حقوق کا ایک بلند معیار قرار دے لیا، لیکن یہ معیار گروہ بندی کی تنگ نظری اور قومی برتری و تسلط کے جذبات پر غالب نہ آسکا جو "ہجومی قومیت" کے لازمی خواص ہیں۔ "قومی برتری" کی حرص نے تصادم و کشاکش کی حالت پیدا کر دی، اور جماعتی ذہنیتوں پر "حق" کی جگہ اسی "طاقت" کے ..... اصول کی فرمانروائی قائم ہو گئی جس کے خلاف اس زور شور سے اعلان جنگ کیا گیا تھا۔ "قومی برتری" کی اس کشاکش نے یورپین طاقتوں کیلئے ایک کبھی ختم نہ ہونے والی باہمی جنگ کی حالت پیدا کر دی ہے۔ ہر

اسپر کوئی تعصب غالب نہ آسکا۔ مسیحیت اور یہودیت کی تاریخی اور روایتی دشمنی مسلّم ہے۔ دُنیا کے کسی گوشہ میں بھی بدنصیب یہودیوں نے وہ ظلم وستم برداشت نہ کئے ہونگے جو یورپ کی مسیحی حکومتوں میں انہیں صدیوں تک جھیلنے پڑے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک کسی انسان کیلئے یہودی ہونا ایک ناقابل معافی جُرم تھا۔ لیکن اب "قومیت کے جذبہ نے یہ تمام جذبات مغلوب کردیئے۔ سب سے پہلے انگلستان اور فرانس نے، پھر بتدریج یورپ کی دُوسری قومیتوں نے اِن کا حق قومیت بھی اُسی طرح تسلیم کرلیا، جسطرح اُن ملکوں کے مسیحی باشندوں کا تسلیم کیا تھا۔ ایک یہودی، انگریز، فرانسیسی یا جرمن ہوکر اُسی طرح ان ملکوں کے شہری اور قومی حقوق سے متمتع ہونے لگا، جس طرح مسیحی باشندے ہوتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں انگریز یہودیوں کے لئے تمام برطانی عہدوں اور منصبوں کے دروازے کھول دئے گئے۔ حتیٰ کہ وزارت کے بڑے سے بڑے مقام کے لئے بھی یہودیت مانع نہ رہی۔

یہ تو اِس "قومیت" کے محاسن تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی:

(۱) یہ جو کچھ بھی ہوا، صرف یورپ میں اور یورپ کے باشندوں میں ہُوا۔ یورپ کے حدود سے باہر کے لئے نہ تو انسانی آزادی کا اعلان موثر ہوسکا، نہ قومی حقوق کا اعتقاد۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم رومن اصول کے مطابق یورپ نے فیصلہ کرلیا کہ دنیا برتر اور کمتر اقوام میں منقسم ہے۔ آزادی اور حقوق کے تمام اصول برتر اقوام کے لئے ہیں نہ کہ کمتر اقوام کے لئے۔ یورپ اور امریکہ دنیا کا نصف برتر حصّہ ہے۔ بقیہ دنیا کمتر حصّہ ہے۔ اس لئے اُسے کوئی حق نہیں کہ انسانی آزادی اور قومی حقوق کا مطالبہ کرے جو برتر انسانوں کیلئے مخصوص ہیں!

(۲) فرانس جسوقت اپنے ملک کے اندر تیسرے انقلاب آزادی کی طیاریاں کررہا تھا، تو اُسوقت کسی فرانسیسی کے ذہن میں اس بات کا خطرہ بھی نہیں گزرا

حق و مساوات کے مقابلہ میں طاقت اتنی سمٹی ہوئی اور مرکزیت کی حالت میں نہیں ہے جسقدر پہلے تھی۔ تاہم جہاں تک انسانی آزادی و مساوات کا تعلق ہے، نوع انسانی اب بھی اُس سے اُسی طرح محروم ہے جس طرح پہلے تھی!

اس سے بھی زیادہ یہ کہ سرمایہ داری کی طاقت نے اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ پچھلے انسانوں پر جو اختیار و تسلط صدیوں کی شاہی نسل اور امیرانہ روایت حاصل کر سکتی تھی۔ اب وہ اختیار چند مہینوں اور برسوں کے اندر ایک سرمایہ دار محض روپیہ کے ذریعہ حاصل کر لیتا ہے اور دُنیا کی صلح و جنگ اور ملکوں اور قوموں کی حکومت و محکومی کی باگ فوراً اس کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے!

اُنیسویں صدی کے "سوشیلزم" کی تخم ریزی اسی ردِ فعل کا نتیجہ تھی۔ اب یہ بڑھتے بڑھتے "کمیونزم" تک پہونچگیا ہے، اور نہ صرف یورپ کا نظام قومیت بلکہ ہیئتہ اجتماعیہ (سوسائٹی) کا پورا نظام اُلٹ دینا چاہتا ہے۔

عالمگیر جنگ یورپ اس نظام قومیت کی نامرادیوں کا سب سے بڑا اعلان تھا۔ ۵ سال تک خون اور آگ میں رہکر جب دُنیا نے دوبارہ سنبھالا لیا تو زندگی اور امن کی جستجو از سرِ نو شروع ہو گئی۔ اُن تمام لوگوں نے جن کی ذہنیت کسی قومی نظام حکومت کی غرض پرستیوں سے آلودہ نہ تھی، محسوس کر لیا کہ پچھلا نظام اب دُنیا کو زیادہ عرصہ تک مطمئن نہیں رکھ سکتا۔ یورپ کے حکما اور مفکرین میں ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو قومیت کی اس عصبیت سے اُکتا گیا ہے اور "قومیت" کی جگہ "انسانیت" کی وسیع فضا ڈھونڈ رہا ہے۔ طرح طرح کے نئے نظرئے اور نئی تجویزیں دماغوں میں نشو و نما پا رہی ہیں۔ "دنیا کے نظام اجتماع کی نئی تقسیم" اور "انسانی برادری کا غیر مشروط حلقہ" وقت کا سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ موضوع فکر ہے۔

قومیت دُوسری قومیت کو پیچھے ہٹانا اور خود آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ مقابلہ کا ایک بڑا میدان مشرق کی کمزوریوں نے بہم پہونچا دیا۔ ہر قوم چاہتی ہے اِس میدان میں سب سے بڑھکر غاصب اور سب سے زیادہ طامع ثابت ہو۔ استعمار، تجارت، اسلحہ سازی، مادی تقدم اور معنوی نفوذ! ہر گوشہ میں دوڑ جاری ہے پچھلی عالمگیر جنگ قومی مزاج کی اِسی مجنونانہ حالت کا نتیجہ تھی، اور ابھی اُس کے عالمگیر مذبح کا خون خشک نہیں ہوا تھا کہ ایک دُوسرے تصادم کا میدان تیار ہونے لگا!

(۴) اِسی طرح قومی "عصبیت" کی ساری مزاجی کیفیتیں اپنی پُوری شدت کے ساتھ پیدا ہو گئیں۔ تمدن کی ترقی، جذبات و امیال کی صورت بدل دیتی ہے نوع نہیں بدل سکتی۔ عرب جاہلیت کا غرور اور ہندوستان کے برہمنوں کی مغرورانہ تنگ دلی ایک دوسری صورت میں اُبھر آئی جو پہلی صورت سے کہیں زیادہ طاقتور اور بے پناہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "انسانیت" کا دائرہ اب بھی ویسا ہی تنگ ہے جیسے پہلے تھا۔

ردِّ فعل

ضروری تھا کہ اِس حالت کا ردِّ فعل پیدا ہو۔ "ہجومی قومیت" کا مجنونانہ غلو اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب دنیا کا تغیر پسند مزاج زیادہ عرصہ تک متحمل نہیں ہو سکتا۔

انیسویں صدی ابھی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی کہ اِس کے آثار شروع ہو گئے سوسائٹی کے نچلے طبقوں نے دیکھا کہ آزادی اور مساوات کی اتنی ہنگامہ آرائیوں کے بعد بھی حقیقی آزادی اور مساوات بدستور مفقود ہیں۔ موجودہ نظام قومیت جو آزادی و مساوات کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا، اب خود آزادی و مساوات کی راہ میں روک بن گیا ہے۔ نئے دور سے پہلے دُنیا کا استبداد اور غیر مساویانہ امتیاز چند افراد اور خاندانوں میں محدود تھا۔ اب وہ بڑے گروہوں میں پھیل گیا ہے۔ اس لئے

اگر بحیثیت مجموعی دُنیا کی موجودہ ذہنی فضا پر نظر ڈالی جائے، تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک موسم ختم ہو رہا ہے اور دوسرے کی آمد آمد ہے۔ جس زمانہ سے ہم گذر رہے ہیں، عجب نہیں مستقبل کا مورخ اس میں عہد تداخل کے آثار کی جستجو کرے۔ نہیں کہا جا سکتا نئے موسم کا پیغام کیا ہوگا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ دُنیا اسوقت تک جن اجتماعی دائروں میں محصور رہی ہے اس سے ایک زیادہ وسیع دائرے کی طرف قدم بڑھائے۔ کیا وہ "انسانیت" اور "انسانی برادری" کی منزل ہوگی؟ کیا دنیا اُس نقطہ تک پہنچ گئی ہے جس نقطہ تک اب سے تیرہ سو برس پہلے اسلام نے اُسے پہنچانا چاہا تھا مگر نہ پہنچ سکی؟ اس کا جواب صرف مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ مگر سردست ہمیں اس جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہ سوال حل کرنا ہے کہ بحالت موجودہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یعنی جہاں تک "قوم" اور "قومیت" کا تعلق ہے، ہمارا طریق کار کیا ہونا چاہئے؟ ناگزیر ہے کہ قیام امن و اصلاح قومیت کے لئے نہ صرف ملت اسلامیہ کو بلکہ تمام دُنیا کو اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق عمل پیرا ہونا پڑیگا: